www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا قرآن پاک کلام الٰہی ہے؟

(اسلام.... ایک تعارف)



مصنف: ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا قرآن کلامِ خداوندی ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء

کتاب : کیا قرآن کلام خداوندی ہے؟

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : سید امتیاز احمد

اہتمام : دار النوادر، لاہور

مطبع : موٹروے پریس، لاہور

قیمت : ۵۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

نشی بک

فضلی بکس سپر مارکیٹ

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، تاجران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7220004
ای میل: hidmat100@hotmail.com

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆......☆......☆

خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

محترم مہمانِ خصوصی جناب رفیق داد صاحب، دیگر مہمانانِ گرامی قدر، محترم بزرگو بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو اسلامی طریقہ سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

''کیا قرآن کلامِ الٰہی ہے؟''

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت محمد ﷺ مذہب اسلام کے بانی تھے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو اس وقت سے موجود ہے جب پہلے انسان نے کرۂ ارض پر قدم رکھا تھا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے زمین پر متعدد انبیائے کرام بھیجے اور ان کے ذریعے اپنا پیغام وحی کی صورت میں ہم تک پہنچایا۔ تمام گزشتہ انبیائے کرام کسی خاص قوم یا علاقے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے اور ان کا پیغام زمانی لحاظ سے بھی ایک خاص عرصے کے لیے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان انبیائے کرام کو معجزات عطا کیے گئے، مثال کے طور پر سمندر میں راستہ بن جانا یا مردے کو زندہ کر دینا، ان معجزات کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ یہ اس دور کے لوگوں کے لیے تو دلیل بن سکتے ہیں لیکن آج یہ ممکن نہیں کہ ان معجزات کی جانچ پرکھ کر کے

انھیں ثابت کیا جاسکے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے۔ جنھیں پوری بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کی نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھی۔ قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ١٠٧]

''اے نبیؐ! ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

چونکہ حضرت محمد ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری پیغام بر تھے اور چونکہ ان کا پیغام پوری انسانیت کے لیے اور ہر زمانے کے لیے تھا، لہٰذا انھیں معجزہ بھی وہ عطا کیا جانا چاہیے تھا جو ہمیشہ باقی رہنے والا اور ہر زمانے کے لیے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے معجزات پر زور نہیں دیا۔ حالانکہ ان سے بہت سے معجزات کا صدور ہوا جن کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ ہم مسلمان ان معجزات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم ایک ہی معجزے کو فخریہ بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قرآن کی صورت میں عطا فرمایا تھا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے۔ چودہ سو سال سے اس کا اعجاز جاری و ساری ہے۔ آج بھی یہ معجزہ ہمارے سامنے ہے، آج بھی اسے پرکھا جاسکتا ہے، اور آئندہ بھی۔

ایک بات جس پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی متفق ہیں وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کو ایک محمد بن عبداللہ ﷺ نامی شخص نے سنہ ٦٠٠ء میں پہلی بار مکہ نام کے شہر میں بیان کیا تھا۔

قرآنِ مجید کا ذریعہ اور منبع کیا ہے؟ اس بارے میں بنیادی طور پر تین نظریات پائے جاتے ہیں۔

- پہلا نظریہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ قرآن کے مصنف ہیں اور قرآن شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی اپنی ہی تصنیف ہے۔
- دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے قرآن دوسرے انسانی ذرائع کی مدد

سے یا دیگر مذہبی متون کی مدد سے تحریر کیا ہے۔

- تیسرا ممکنہ نظریہ یہ ہے کہ قرآن انسانی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ وحی کی صورت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

آیئے ہم ان تینوں نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

پہلا ممکنہ مفروضہ یہ ہے کہ قرآن شعوری، لاشعوری یا تحت الشعوری طور پر خود نبی اکرمؐ کی تصنیف ہے اور انھوں نے خود یہ کتاب تحریر کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے اور عظیم الشان کام کی تخلیق سے دستبردار ہوتا ہے تو اس کے اس دعوے کو جھٹلانا دیسے ہی ایک غیر منطقی بات بن جاتی ہے، لیکن مستشرقین بالعموم قرآن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے یہی کرتے ہیں۔ وہ قرآن کی اصل پر شکوک کا اظہار کرتے ہوئے یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ہی قرآن کے مصنف ہیں۔

حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں فرمایا۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ قرآن وحی خداوندی ہے، منزل من اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے برعکس دعویٰ کرنا ایک غیر منطقی بات ہے اور دراصل یہ کہنا ہے کہ (نعوذ باللہ من ذالک) رسول اللہ ﷺ سچ نہیں بول رہے تھے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری حیات طیبہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ نبوت سے پہلے ان کی زندگی چالیس برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اور اس پورے عرصے کے دوران انھیں ایک متقی، پرہیزگار، شریف اور باکردار شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اہل مکہ انھیں صادق اور امین کے القاب سے پکارا کرتے تھے، دوست دشمن سب ان کی سچائی اور امانت داری پر متفق تھے۔

حتیٰ کہ وہ لوگ، جنھوں نے ان کے دعویٰ نبوت کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ بھی اپنی امانتیں انھی کے پاس رکھوایا کرتے تھے۔ نبوت کے اعلان کے بعد بھی آپ ﷺ کی امانت داری پر ان کا اعتماد اسی طرح برقرار تھا۔

اس صورت میں یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ اس قدر ایمان دار اور سچا شخص ایک جھوٹا دعویٰ کرے (نعوذ باللہ) اور کہے کہ وہ پیغمبر ہے، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ دراصل ایسا نہ ہو۔ بھلا وہ ایسا کیوں کر کریں گے۔

کچھ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ایسا مادی فوائد کے حصول کے لیے کیا تھا۔ دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ (نعوذ باللہ) یقیناً کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دولت اور مفادات کے حصول کی خاطر نبوت یا ولایت کا جھوٹا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگ نہایت پرتعیش زندگی گزارتے ہیں۔ ایسی مثالیں دنیا بھر میں موجود ہیں۔ خصوصاً ہمارے ملک انڈیا میں تو ایسی مثالیں بہت ہی زیادہ ہیں۔

لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اعلانِ نبوت سے قبل ایک نسبتاً بہتر معاشی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا نکاح ایک امیر کاروباری خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ یعنی اعلانِ نبوت سے پندرہ سال پہلے۔

اعلانِ نبوت کے بعد آپ ﷺ کے معاشی حالات کبھی قابلِ رشک نہیں رہے۔

امام النووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ریاض الصالحین کی حدیث نمبر ۴۹۲ میں کہا گیا ہے:

"ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو ماہ تک ہمارے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔"

یعنی دو دو ماہ تک حضرت نبی کریم ﷺ اور آپ کے اہل خانہ پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے اور صرف پانی اور کھجوروں پر گزارا فرمایا کرتے تھے یا بعض اوقات بکری کا دودھ جو اہل مدینہ پیش کردیا کرتے تھے، اس سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی محدود اور عارضی وقفے کے دوران ایسا ہوا ہو۔ بلکہ حضرتِ محمد ﷺ کا طرزِ زندگی ہی ایسا تھا۔ ریاض الصالحین کی ایک اور حدیث ہے:

"حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو تحائف

وصول ہوتے تو آپ فوراً انھیں غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے، کبھی اپنے لیے کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔"

اس صورتِ حال میں نبی کریم ﷺ کے حوالے سے یہ کس طرح سوچا جاسکتا ہے کہ "نعوذ باللہ" آپ ﷺ نے مادی فواید حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہوگا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ۷۹]

"پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں، پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تا کہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔"

یہ آیت انھی لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دراصل یہ بات وحی الٰہی ہے۔ یا وہ وحی خداوندی میں کسی طرح کی تبدیلی کرتے ہیں۔

اگر اس بات کا ذرا سا بھی امکان ہوتا کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی تحریر ہے، یا اس میں نبی کریم ﷺ نے کوئی بھی تبدیلی کی ہے (نعوذ باللہ) تو کیا یہ آیت قرآن میں موجود ہوتی؟ ہرگز نہیں، کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوتا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خود اپنے آپ کو بُرا کہہ رہے ہوں۔

کچھ لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ، شان و شوکت اور جاہ و حکومت کے لیے کیا تھا۔

لیکن وہ لوگ جنھیں جاہ و حشمت، شان و شوکت اور قوت و دولت کی خواہش ہوتی ہے، ان کی زندگیاں کس طرح کی ہوتی ہیں؟ وہ لوگ عالیشان محلوں میں رہتے ہیں، زرق برق

لباس زیب تن کرتے ہیں۔ ان کے اردگرد دربان ہوتے ہیں۔ نوکر چاکر ہوتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے کہ وہ اپنی بکری کا دودھ بھی خود دوہتے تھے۔ اپنے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے۔ اپنی جوتی کو خود پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر کے دیگر کام بھی خود فرما لیا کرتے تھے۔ ان کا طرزِ زیست سادگی اور انکسار کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

آپ ﷺ زمین پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ بغیر محافظوں کے رہتے۔ تنہا بازار میں خریداری کے لیے چلے جاتے۔ اگر کوئی غریب ترین شخص بھی آپ کو مدعو کرتا تو آپ اس کی دعوت رد نہ فرماتے اور جو کچھ بھی دعوت میں موجود ہوتا برضا و رغبت تناول فرماتے۔ یہاں تک کہ خود قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ [التوبة: ٦١]

''ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی ﷺ کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو، وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا ہے۔ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایمان دار ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔''

ایک دفعہ کفار کی جانب سے عتبہ نامی ایک سردار نمائندہ بن کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ ''اگر تم نے نبوت کا دعویٰ دولت کے لیے کیا ہے تو ہم تمہارے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، اگر حکومت کے لیے کیا ہے تو ہم تمہیں عربوں کا بادشاہ بنا لیتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ تم پیغام توحید سے دستبردار ہو جاؤ۔'' لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات ماننے سے انکار فرما دیا۔

اسی طرح ایک دفعہ خود رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بھی کوشش کی کہ آپؐ اپنا پیغام پھیلانے سے باز آ جائیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا:

''اے چچا، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں، پھر بھی میں یہ جدوجہد نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ مجھے موت آ جائے۔''

ایک ایسے شخص کو اس قدر تکلیف اور قربانی والی زندگی گزارنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے تھے۔

مزید برآں، آپؐ کی شخصیت میں اس قدر انکسار اور شرافت تھی کہ آپ ﷺ نے اپنی ہر کامیابی کے موقع پر یہی ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، میری ذاتی صلاحیت کی وجہ سے نہیں ہے۔

بعض مستشرقین نے ایک نیا مفروضہ پیش کر دیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دراصل (نعوذ باللہ) ایک دماغی عارضے میں مبتلا تھے۔ اس عارضے کو (Mythomania) کہتے ہیں اور اس میں مبتلا شخص جھوٹ بولتا ہے، لیکن اسے خود اپنے جھوٹ پر پورا یقین ہوتا ہے۔ لہٰذا ان مستشرقین کا کہنا (نعوذ باللہ) یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جھوٹ بولتے تھے لیکن انھیں خود اس پر پورا یقین ہوتا تھا۔

اگر ایک ماہر نفسیات نے Mythomania میں مبتلا مریض کا علاج کرنا ہو تو وہ کیا کرے گا؟ اسے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ مریض کو حقایق کا سامنا کرنے پر مجبور کر دے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ شاہِ انگلستان ہے۔ معالج اسے یہ نہیں کہے گا کہ تم دیوانے ہو چکے ہو بلکہ وہ اس سے سوال کرے گا کہ اچھا اگر تم شاہِ انگلستان ہو تو بتاؤ تمھاری ملکہ کہاں ہے؟ تمہارے وزراء اور درباری کہاں ہیں؟ دربان اور محافظ کہاں ہیں؟ معالج جب حقایق اس کے سامنے لاتا جائے گا تو بالآخر Mythomania کا مریض خود ہی کہہ دے گا کہ ''میرا خیال ہے کہ میں شاہِ انگلستان نہیں ہوں۔''

یہی کام قرآن کرتا ہے، قرآن لوگوں کے سامنے حقایق رکھتا ہے پھر ان سے سوالات کرتا ہے۔ یعنی درحقیقت پیغمبر اسلام ﷺ (نعوذ باللہ) Mythomaniac نہیں تھے بلکہ درحقیقت پیغمبر ﷺ کا انکار کرنے والے اس عارضے میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ پیغمبر ﷺ کی دعوت کا انکار کر رہے ہیں اور اپنے اس غلط موقف پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ قرآن ان لوگوں کے سامنے سوالات رکھتا ہے کہ اگر تمہیں شک ہے، اگر تم اسے حق نہیں سمجھتے تو پھر ایسا کرو...... اور ایسا کرو یا اگر قرآن اللہ کی جانب سے نہ ہوتا پھر یوں ہوتا۔ قرآن ایسے متعدد سوالات کرتا ہے، جن کے بارے میں ہم ان شاء اللہ آگے گفتگو کریں گے۔

کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ قرآن دراصل ایک مذہبی واہمہ ہے یا لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ، غیر شعوری طور پر اپنے خیالات قرآن کی صورت میں پیش کر دیتے تھے۔ یہ لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ذہنی توازن ہی درست نہیں تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

یہ لوگ ایک بنیادی حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن کا عرصۂ نزول ۲۳ برس کے طویل عرصے پر مشتمل ہے۔ اگر قرآن رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی بار پیش کیا ہوتا تو ان معترضین کو یہ بات کرنے کا موقع مل بھی سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا نزول ۲۳ سال کے عرصے میں بہ تدریج ہوا تھا۔ اگر یہ لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہوتا تو اس میں یکسانیت اور روانی کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر ان لوگوں کے دعوے کے مطابق قرآن حکیم آنحضرتؐ کے تحت الشعوری خیالات اور آپؐ کے ابنارمل دماغ کا نتیجۂ فکر ہوتا (نعوذ باللہ) تو اس میں تضاد موجود ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ ۲۳ سال تک مسلسل ایک بات کرنا، ایک دعویٰ کرنا اور اس پر مسلسل قایم رہنا ممکن ہی نہیں ہے، اگر یہ دعویٰ محض لاشعوری خیالات کا نتیجہ ہوتا۔ قرآن خود ایسے کسی دعوے کی تردید کے لیے کافی ثبوت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن متعدد تاریخی واقعات کا حوالہ دیتا ہے جو اُس وقت کسی کے علم میں نہیں تھے لیکن درست ثابت ہوئے۔

اسی طرح قرآنِ مجید متعدد پیش گوئیاں بھی کرتا ہے اور یہ تمام پیش گوئیاں حرف بہ حرف پوری ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایسے متعدد سائنسی حقایق کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے جو اُس وقت لوگوں کے علم میں ہی نہیں تھے لیکن آج ان کی تصدیق ہو چکی ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ لاشعوری خیالات کی مدد سے اس قسم کی پیش گوئیاں کی جاسکیں۔

خود قرآن اس بات کی گواہی سورۂ اعراف میں اس طرح دیتا ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾

[الاعراف : ١٨٤]

"اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔"

اسی طرح سورۃ القلم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ ﴾ [القلم : ٢]

"تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔"

مزید فرمایا گیا:

﴿ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ ﴾ [التكوير : ٢٢]

"اور (اے اہل مکہ) تمھارا رفیق مجنون نہیں ہے۔"

لہٰذا کوئی شخص جھوٹ کس طرح بولے گا؟

یہاں تمام نظریات کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن وقفۂ سوالات کے دوران آپ سوالات کر سکتے ہیں اور ان شاء اللہ میں جواب دینے کی پوری کوشش کروں گا۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے قرآن دیگر مذہبی کتابوں کی مدد سے یا انسانی ذرائع کی مدد سے تحریر کیا۔ (نعوذ باللہ) اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے تو ایک تاریخی حقیقت پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے محبوب پیغمبر حضرت

محمد مصطفیٰ ﷺ پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہیں تھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ ۝ ﴾ [العنكبوت: ٤٨]

''(اے نبی ﷺ!) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں تھا کہ لوگ قرآن کے بارے میں شک کریں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ربّ حکیم نے اپنی حکمت کاملہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آخری پیغمبر ﷺ کو اُمّی یعنی رسمی تعلیم سے ناآشنا ہونے کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔

بصورتِ دیگر یہ بات ضرور کی جاتی، باطل پرست لوگ، غیر سنجیدہ لوگ ایسی باتیں ضرور کرتے یا انھیں ایسی باتیں کرنے کا موقع ضرور مل جاتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ تعلیم یافتہ ہوتے تو منفی ذہنیت رکھنے والے لوگ ضرور یہ دعویٰ کرنے کی کوشش کرتے کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے کسی انسانی ذریعہ سے یہ معلومات حاصل کرکے قرآن کی صورت میں پیش کردی ہیں۔

لیکن الحمدللہ ان معترضین کے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ اس مفروضے کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الٓمٓ ۝ تَنزِيلُ ٱلْكِتَٰبِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ أَمْ يَقُولُونَ ٱفْتَرَىٰهُ ۚ بَلْ هُوَ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّآ أَتَىٰهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ ﴾ [السجدہ: ۳-۱]

''ا-ل-م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے

رب کی طرف سے تا کہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔''

قرآن کا اسلوب بیان دوسرے مذہبی صحیفوں کے متن سے بالکل مختلف ہے۔ دیگر مذہبی کتابیں بالعموم داستانی انداز لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ کسی انسان کی تحریر کردہ داستان کا طرزِ آغاز کیا ہوتا ہے؟ بالعموم یہ اس طرح شروع ہوتی ہیں۔

''ایک دفعہ کا ذکر ہے.....................''

اسی طرح اگر آپ دیگر مذہبی متون کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا آغاز بھی کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔

''سب سے پہلے خدا تھا، اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا.....................''

یا یہ کہ:

''سب سے پہلے لفظ تھا.....................''

لیکن قرآن کا اسلوب اس انسانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح اگر آپ دیگر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک خاص ترتیب سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، اگر کسی شخص کا ذکر ہے تو اس کے خاندان کا ذکر ہوگا، اس کی اولاد کا بیان ہوگا اور اسی طرح بالترتیب واقعات بیان ہوتے چلے جائیں گے۔ پہلا باب پھر دوسرا باب، اسی طرح آخر تک ترتیب ہوگی۔

قرآن بھی لوگوں کے بارے میں، ان کے خاندانوں کے بارے میں بات کرتا ہے لیکن قرآنی اسلوب، انسانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ کسی انسان کی لکھی ہوئی کہانیوں کی کتاب سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن اپنا ایک منفرد اسلوب بیان رکھتا ہے۔ یہ ایک منفرد کتاب ہے۔

جب لوگ قرآن کو انسانی تحریر ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر ایک نیا دعویٰ لے کر سامنے آ جاتے ہیں کہ یہ دھوکہ ہے۔ انھیں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی ایک

معمولی سا ثبوت بھی نہیں ملتا۔ مگر یہ لوگ پھر بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور خود کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ فرض کیجیے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ فلاں شخص میرا دشمن ہے۔ میرے پاس بات کے لیے کوئی ثبوت یا شہادت بھی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اس بات پر پورا یقین ہے، لہٰذا جب بھی وہ شخص میرے سامنے آتا ہے میں اس کے ساتھ دشمنوں والا رویہ ہی اختیار کرتا ہوں۔ جوابی طور پور اس کا رویہ بھی میرے ساتھ خراب ہو جاتا ہے، بالآخر وہ بھی مجھ سے دشمنوں کی طرح پیش آنے لگتا ہے اور پھر میں کہتا ہوں:

> ''دیکھا! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ شخص میرا دشمن ہے کیوں کہ وہ مجھ سے دشمنوں کی طرح پیش آرہا ہے۔''

سو ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایک غلط بات مان لیتے ہیں اور پھر بیوقوفوں کی طرح اس پر اڑے رہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا ہے کہ وحی عقل انسانی کے مطابق ہے لیکن بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ متونِ مقدسہ عقل انسانی سے ماورا ہیں۔ اگر یہ متونِ مقدسہ واقعی ہماری عقل و فہم سے ماورا ہیں تو پھر انھیں سمجھنا کیوں کر ممکن ہوگا؟ یہ کس طرح معلوم کیا جا سکے گا کہ کون سا مذہبی متن واقعی وحی خداوندی ہے اور کون سا نہیں؟

قرآن تو خود اپنے قاری کو تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مکالمے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بہت سے مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ مذہبی مباحث سے بچنا چاہیے اور جہاں معاملہ مذہب کا ہو، کسی مباحثے سے پرہیز ہی بہتر ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ رویہ غلط ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۲۵]

''(اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

چناں چہ ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ عربی لفظ ﴿ قالوا ﴾ قرآنِ مجید میں ۳۳۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے ''وہ کہتے ہیں'' اور اسی طرح لفظ ﴿ قل ﴾ بھی اتنی ہی مرتبہ یعنی ۳۳۲ مرتبہ قرآن میں آیا ہے، اس لفظ کا مطلب ہے ''کہو''۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مکالمے اور مباحثے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

ایک نظریہ ہے جسے ''Exhausting the alternatives'' کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی دعوے کے متبادل تمام دعوے ختم کر دینا، متبادل صورتیں رد کر دینا، اس طرح اصل دعویٰ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ کلامِ خداوندی ہے، اگر تم یہ بات تسلیم نہیں کرتے تو بتاؤ یہ کیا ہے؟ آپ متبادل دعویٰ کرتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے، قرآن اس بات کو غلط ثابت کر دیتا ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے مادی مفادات کے لیے قرآن پیش کیا تھا اور یہ دعویٰ بھی بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف متبادل صورتیں پیش ہوتی اور رد ہوتی چلی جاتی ہیں اور تمام متبادل دعوے رد ہونے کے بعد اس سوال کا ایک ہی جواب باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے، کلامِ خداوندی ہے کیوں کہ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟

سورۂ جاثیہ میں فرمایا گیا:

﴿ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾

[الجاثیہ: ۲-۱]

''ح۔م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔''

یہ بات قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر کی گئی ہے کہ قرآن کلامِ خداوندی ہے۔

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ﴾ [الانعام: ۱۹]

''اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے،سب کو متنبہ کردوں۔''

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ﴾ [یوسف: ۱۰۲]

''اے نبیؐ! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کررہے ہیں۔''

﴿ طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ○ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○ ﴾ [طٰهٰ: ۳-۱]

''طٰہٰ۔ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔یہ تو ایک دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔''

﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ○ ﴾ [النمل: ٦]

''بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم وعلیم ہستی کی طرف سے پارہے ہو۔''

سورۂ سجدہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ الٓمّٓ ○ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ ﴾ [السجدہ: ۳-۱]

''ا۔ل۔م۔اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا،شاید کہ وہ ہدایت پاجائیں۔''

اسی طرح سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا:

﴿ يٰسٓ ○ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ○ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ عَلٰى صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ۵۔۱]
''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾ [الزمر: ۱]
''اس کتاب کا نزول، اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾ [الجاثیہ: ۲]
''اس کتاب کا نزول، اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔''

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ ﴾ [الرحمٰن: ۲۔۱]
''نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔''

﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [الواقعہ: ۸۰۔۷۷]
''یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔''

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝ ﴾ [الدھر: ۲۳]
''(اے نبیؐ!) ہم نے ہی یہ قرآن تم پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔''

اسی طرح متعدد دیگر مقامات پر بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بتاؤ یہ کیا ہے؟

سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سائنس کی دنیا کا ایک اپنا طریقۂ کار ہے۔ کسی نئے نظریے کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہوگا کہ اگر اس کا کوئی تردیدی امتحان نہیں ہوسکتا تو وہ اس نظریے پر توجہ ہی نہیں دیں گے۔

تفصیل میں جانے کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ مختصراً سمجھ لیجیے کہ یہ نظریہ تردیدیت (Falsification) کہلاتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ اگر آپ نئے نظریے کا Filsifi-

cation test- نہیں کر سکتے تو پھر ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں جب آئن سٹائن نے ایک نیا نظریہ پیش کیا تو ساتھ ہی اس نے تین Falsification Test بھی پیش کر دیے کہ اگر میرا نظریہ درست نہیں ہے تو ان تین طریقوں سے ان نظریے کو غلط ثابت کر دیا جائے، یعنی یہ تین امتحان ایسے ہیں جن سے نظریے کے درست یا غلط ہونے کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اور سائنسدانوں نے چھ برس تک غور و فکر کرنے کے بعد تسلیم کیا کہ ہاں البرٹ آئن سٹائن کا نظریہ درست ہے۔ اس طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی عظیم شخصیت ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ نظریہ قابل غور اور قابل توجہ ہے۔

قرآن کے معاملے میں ایسے متعدد ''تردیدی امتحان'' (Falsification Test) موجود ہیں۔ اگر آئندہ آپ کی کسی سے مذہب کے بارے میں گفتگو ہو تو ایک سوال ضرور کریں کہ '' کیا اُس کے پاس کوئی ایسا امتحان ہے جس کی مدد سے اس کے مذہب کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہو؟''

یقین کیجیے میں نے متعدد لوگوں سے یہ سوال کیا ہے اور آج تک کسی نے یہ جواب نہیں دیا کہ ہاں میرے پاس اپنے مذہب کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی امتحان موجود ہے۔

لیکن قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن ایسے متعدد پیمانے، ایسے تردیدی امتحان پیش کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو صرف ماضی کے لیے تھے جب کہ کچھ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔

میں آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

رسول اللہ ﷺ کے ایک چچا کا نام ابولہب تھا۔ اس کا شمار پیغمبر اسلام ﷺ کے شدید ترین مخالفین میں ہوتا تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرتا، اور جب بھی رسول اللہ ﷺ کو کسی اجنبی سے بات کرتے دیکھتا تو ان کے جانے کے بعد فوراً اس سے پوچھتا کہ محمد بن عبداللہ ﷺ نے تم سے کیا بات کی ہے؟ اور اس کے الٹ باتیں

کرتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے کہا ہوتا کہ دن ہے تو یہ کہتا کہ رات ہے۔ یعنی ہر بات کی مخالفت کرتا۔

قرآنِ مجید میں سورۃ لہب نام کی ایک پوری سورۃ موجود ہے۔ اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے کہ ابولہب اور اس کی بیوی کو ان کے اعمال کے سبب جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ گویا بالواسطہ طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوگا، کافر ہی رہے گا۔

یہ سورۃ ابولہب کی موت سے کوئی دس برس پہلے نازل ہوئی تھی۔ یعنی اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد دس سال تک ابولہب زندہ رہا۔ اس عرصے میں ابولہب کے دوستوں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے، جو خود بھی اس کی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مخالف تھے۔

چوں کہ ابولہب رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کی مخالفت کرتا تھا، ہر بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا، لہٰذا اسے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ اسلام قبول کرنے کا اعلان کردیتا۔ اسے اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی ضرورت نہ تھی، مسلمانوں والی عادات اپنانا لازم نہ تھا، صرف قبولِ اسلام کا اعلان کر کے وہ رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) غلط ثابت کرسکتا تھا۔ وہ دعویٰ کرتا کہ میں مسلمان ہوں اور قرآن کو غلط قرار دے دیتا۔ یہ کام اس کے لیے انتہائی آسان تھا۔ وہ پہلے بھی کذب بیانی سے کام لیتا تھا۔ ایک اضافی جھوٹ ہی تو بولنا تھا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے رسول اللہ ﷺ اسے خود دعوت دے رہے ہوں کہ تم میرے دشمن ہو، مجھے غلط ثابت کرنا چاہتے ہو تو آؤ! اسلام قبول کرنے کا اعلان کرو اور مجھے غلط ثابت کردو!

یہ کام انتہائی آسان تھا لیکن وہ نہیں کر پایا۔ یہ بات واضح ہے کہ کوئی انسان اپنی کتاب میں ایسا دعویٰ کرنے کی، ایسا بیان دینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہ یقیناً کلامِ خداوندی ہی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال سورۂ بقرہ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ٥ ﴾ [البقرة: ٩٥-٩٤]

''ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے ہی مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو، یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں سے انھوں نے جو کچھ کما کر وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔''

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک گفتگو کے درمیان میں یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آخرت کا گھر یعنی جنت صرف انھی کے لیے ہے، کسی اور کے لیے نہیں، اس کے بعد مذکورہ آیت نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ اگر واقعی جنت صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہے اور وہی جنت میں جائیں گے تو پھر تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، مرنے کی خواہش کرو۔

اس موقع پر صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ یہودیوں میں سے ایک شخص سامنے آتا اور کہتا کہ ہاں میں مرنے کی تمنا رکھتا ہوں۔ صرف دعویٰ ہی تو کرنا تھا۔ واقعی مرنا ضروری نہیں تھا صرف زبانی کہنا تھا کہ میں مرنا چاہتا ہوں اور وہ قرآنی بیان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ لیکن کوئی یہودی آگے نہیں بڑھا، کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ ہاں میں موت کی تمنا رکھتا ہوں۔

یہ بڑا واضح تردیدی امتحان Falsification Test تھا جو قرآن نے پیش کیا۔

لیکن ہوسکتا ہے آپ مجھ سے کہیں کہ یہ تمام باتیں ماضی کی ہیں، یہ امتحان لینا تو ماضی میں ہی ممکن تھا۔ کیا آج کے لیے بھی کوئی ایسا امتحان موجود ہے جس کی مدد سے قرآن کو (معاذ اللہ) غلط ثابت کیا جاسکے۔

یقیناً ایسے Falsification Test بھی ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کے لیے بھی تھے، آج کے لیے بھی کارآمد ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی رہیں گے۔ مثال کے طور پر، بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ ﴾

[بنی اسرائیل: ۸۸]

”کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔“

اس آیت کریمہ میں ایک چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر پوری بنی نوع انسان اور سارے جنات مل کر قرآن جیسی ایک کتاب بنانا چاہیں تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

قرآنی عربی اس قدر واضح، قابل فہم، معجزاتی اور ناقابل تقلید ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس کے باوجود قرآن کا ہر بیان حق اور سچائی کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ زبان و بیان کا اعلیٰ ترین اسلوب ہے جو اس کو وحی خداوندی ثابت کرتا ہے، قرآن کی ہر آیت بیک وقت ایک عام آدمی پر بھی اثر کرتی ہے اور ایک پڑھے لکھے عالم فاضل آدمی کو بھی متاثر کرتی ہے۔ حالاں کہ قرآن شاعری بھی نہیں۔ یہ وزن اور قافیہ ردیف سے

بھی کام نہیں لیتا۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک معجزاتی کتاب ہے۔

یہ چیلنج قرآن میں دوبارہ، ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ [الطور: ٣٤-٣٣]

''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے، اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنالائیں۔''

اس آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس امتحان کو لوگوں کے لیے مزید آسان بنا دیا گیا ہے۔ بلکہ سورۂ ھود میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ [هود: ١٣]

''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو، اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنالاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلالو اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔''

لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی یہ چیلنج پورا نہ کرسکا اور قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر پیش نہیں کرسکا۔

سورۂ یونس میں یہ امتحان مزید آسان بنا کر پیش کیا گیا۔ وہاں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ [يونس: ٣٨]

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے خود اسے تصنیف کرلیا ہے؟ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کرلاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر

جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو۔"

لیکن یہ لوگ اتنا بھی نہیں کر پائے۔ کوئی ایک سورۃ بنا کر نہیں لا سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس Falsification Test کو آسان ترین صورت میں بھی پیش کر دیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ○ ﴾ [البقرة: ٢٤-٢٣]

"اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورۃ بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔"

قرآن نے چیلنج دیا کہ اس جیسی کتاب بنا کر دکھاؤ، پھر آسان کر دیا کہ چلو دس سورتیں ایسی بنا کر لے آؤ، پھر اس چیلنج کو آسان تر بنا کر فرمایا کہ ایک سورۃ بنا کر دکھا دو۔ یہاں آسان ترین معاملہ کر دیا گیا ہے کہ چلو اس سے ملتی جلتی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔ اس جیسی نہیں اس کے مانند ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ دیگر جگہوں پر لفظ ﴿ مِثْلِهٖ ﴾ استعمال ہوا تھا۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿ مِنْ مِّثْلِهٖ ﴾ یعنی "اس سے ملتی جلتی"۔ لیکن پھر بھی کفارِ عرب بری طرح ناکام ہوئے۔

عربی زبان و ادب، اپنی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے لحاظ سے نزولِ قرآن کے زمانے میں اپنے عروج پر تھے۔ متعدد کفارِ عرب نے کوشش کی اور بری طرح ناکام رہے۔

اس قسم کی بعض کوششیں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہ گئیں اور آج بھی لوگ انھیں پڑھ پڑھ کر ہنستے ہیں۔

یہ چیلنج آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دیا گیا تھا اور آج بھی موجود ہے۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ قبطی عیسائی موجود ہیں۔ یہ لوگ نسلاً عرب ہیں۔ ان کی مادری زبان عربی ہے۔ یہ چیلنج ان کے سامنے بھی موجود ہے۔

اگر وہ بھی چاہتے ہیں کہ قرآن کو غلط ثابت کر دیں (معاذ اللہ) تو انھیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ قرآن جیسی ایک سورۃ بنا کر دکھا دیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو صورت یہ ہے کہ قرآن کی بعض سورتیں انتہائی مختصر ہیں اور چند الفاظ پر ہی مشتمل ہیں، لیکن نہ تو آج تک کوئی یہ چیلنج قبول کر سکا ہے اور نہ ہی کبھی آئندہ قبول کر پائے گا۔ ان شاء اللہ۔

ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کوئی یہ کہے کہ عربی میری مادری زبان نہیں ہے، میں یہ زبان جانتا ہی نہیں۔ میں یہ امتحان کیسے دے سکتا ہوں۔

قرآن غیر عربوں کے لیے بھی ایک معیار پیش کر دیتا ہے، دنیا کا کوئی بھی شخص، خواہ وہ عربی نہ جانتا ہو، اس طرح قرآن کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ [النساء: ۸۲]

”کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔“

گویا ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ اگر قرآن کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہو تو صرف اتنا کرو کہ قرآن میں تضاد یا اختلاف بیانی کی کوئی ایک ہی مثال پیش کر دو۔ قرآن کی کوئی ایک غلطی، تضاد یا اختلاف دکھا دو اور تم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ قرآن کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ انتہائی سیدھی سی بات ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سینکڑوں لوگ یہ کوشش کر چکے ہیں۔قرآن میں غلطیوں اور تضادات کی بزعم خویش نشان دہی کر چکے ہیں۔لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سو فی صد صورتوں میں یا تو غلط بیانی کی گئی ہے، سیاق وسباق سے ہٹ کر بات کی گئی ہے، غلط ترجمہ کیا گیا ہے یا دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔آج تک کوئی بھی شخص قرآن میں کوئی ایک غلطی یا تضاد بھی ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

فرض کیجیے ایک مولانا صاحب ہیں، جو تاریخ اسلام کے بارے میں اچھا علم رکھتے ہیں لیکن جدید سائنس کے بارے میں علم نہیں رکھتے۔ میں بہت سے ایسے علما کو جانتا ہوں جو دینی علوم میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور سائنس میں بھی، لیکن میں ایک ایسے عالم کی مثال دے رہا ہوں جو دینی علوم کا تو ماہر ہے لیکن سائنسی علوم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔اگر ایسے کسی عالم کے سامنے یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ قرآن میں فلاں فلاں سائنسی اغلاط موجود ہیں اور یہ عالم جواب نہ دے پائے، وضاحت نہ کر سکے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن میں واقعی یہ غلطیاں موجود ہیں اور یہ کہ قرآن (نعوذ باللہ) کلامِ خداوندی نہیں ہے۔

کیوں کہ قرآن تو کہتا ہے کہ:

﴿ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان : ٥٩]

"جاننے والے سے پوچھو۔"

اگر آپ قرآن کے کسی سائنسی بیان کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی ایسے شخص سے پوچھنا پڑے گا جو سائنس کے بارے میں جانتا ہو۔اسی صورت میں آپ کو پتہ چل سکے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

اسی طرح فرض کیجیے حاضرین میں سے کوئی قرآن میں (نعوذ باللہ) کسی گرامر کی غلطی کے بارے میں دعویٰ کر دیتا ہے۔ میں عربی زبان کا ماہر نہیں ہوں۔ میں محض ایک طالب علم ہوں۔اب اگر میں سوال کا جواب دے سکتا ہوں تو الحمد للہ لیکن اگر میں اپنے محدود علم کی وجہ سے، عربی زبان میں مہارت نہ رکھنے کی وجہ سے جواب نہیں دے پاتا تو اس کا مطلب یہ

نہیں کہ واقعی غلطی موجود ہے۔ جو شخص اس شعبے کا ماہر ہوگا وہ جواب دے دے گا۔

آج تک کوئی شخص قرآن میں کوئی غلطی ثابت نہیں کر سکا اور نہ ہی آئندہ کوئی ثابت کر پائے گا۔

مندرجہ بالا گفتگو کے بعد کوئی ایسا شخص جو خدا پر ایمان رکھتا ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآنِ مجید کلامِ خداوندی نہیں ہے، منزل من اللہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، ان کا معاملہ ہی دوسرا ہے، لیکن جو لوگ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں وہ مذکورہ بالا دلائل دیکھنے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن وحی خداوندی نہیں ہے۔

لہٰذا اب ہمارے پاس تین بنیادی نظریات میں سے آخری نظریہ ہی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب منجانب اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے۔

رہی بات دہریوں کی۔ جو کسی خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ خدا پر یقین نہ رکھنے والے جو حضرات آج یہاں تشریف فرما ہیں، میں انھیں مبارک باد دینا چاہوں گا۔ میں لا مذہب لوگوں کو یہ مبارکباد اس وجہ سے دے رہا ہوں کہ وہ اپنی عقل استعمال کر رہے ہیں۔ سوچنے سمجھنے کی طاقت سے کام لے رہے ہیں۔

خدا پر یقین رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کا معاملہ اندھے ایمان کا ہوتا ہے، ایک شخص بالعموم اس لیے عیسائی ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہی عیسائی کے گھر میں ہوا تھا۔ یا اس لیے ہندو ہوتا ہے کہ وہ ہندو کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ کچھ مسلمان بھی محض اس لیے مسلمان ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والدین مسلمان تھے۔ بیش تر لوگ ایک اندھا عقیدہ رکھتے ہیں۔

جب کہ ایک لا مذہب سوچتا ہے۔ اگر وہ ایک مذہبی گھرانے سے بھی تعلق رکھتا ہے تو پھر بھی وہ سوچتا ہے کہ "یہ لوگ کیسے خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟ ایک ایسے خدا پر جو انسانی خصوصیات رکھتا ہے، وہ خصوصیات جو مجھ میں بھی موجود ہیں، میں ایسے خدا پر کیوں ایمان لاؤں؟" لہٰذا وہ اعلان کرتا ہے کہ خدا موجود ہی نہیں۔ یوں وہ خدا کی ہستی کا انکار کر دیتا ہے۔

کچھ مسلمان مجھ سے پوچھیں گے کہ ذاکر صاحب، آپ ایک لا مذہب شخص کو ایک دہریے کو کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں؟

میں اسے اس لیے مبارک باد دے رہا ہوں کہ وہ کلمہ شہادت کے پہلے حصے کو قبول کر چکا ہے۔ وہ ''لا الہ'' کو تسلیم کر چکا ہے۔ اب اسے صرف ''الا اللہ'' کو تسلیم کرنا ہے، جس کے حوالے سے ہم ان شاء اللہ گفتگو کریں گے۔ وہ کلمے کے پہلے حصہ کے حوالے سے غور و فکر کر چکا ہے، وہ خدا کے کسی غلط تصور کو تسلیم نہیں کرتا لہٰذا اب یہ ہمارا فرض ہے کہ خدا کا صحیح تصور اس کے سامنے پیش کریں۔ اور خدائے واحد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا وجود اس پر ثابت کریں۔

جب بھی کوئی دہریہ میرے سامنے یہ کہتا ہے کہ میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا تو میں اس سے ایک سوال کرتا ہوں۔

''یہ بتاؤ تمھارے نزدیک خدا کی تعریف کیا ہے؟''

اور اسے جواب دینا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کیوں؟

فرض کیجیے میں کہتا ہوں کہ ''یہ ایک قلم ہے'' اور آپ کہتے ہیں کہ ''یہ ایک قلم نہیں ہے'' تو پھر ضروری ہے کہ آپ جانتے ہوں کہ قلم کہتے کسے ہیں؟ آپ کو قلم کی تعریف معلوم ہونی چاہیے۔

اگر عام حالات میں آپ کو قلم کی تعریف معلوم نہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ''یہ قلم نہیں ہے'' تو پھر ضروری ہے کہ آپ جانتے ہوں کہ قلم کہتے کسے ہیں؟ قلم کی تعریف کیا ہے؟

اسی طرح اگر ایک دہریہ شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''خدا نہیں ہے'' تو اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ خدا کہتے کسے ہیں؟ لفظ ''خدا'' کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اور جب میں اس دہریے سے یہ سوال کرتا ہوں تو وہ مجھے جواب دیتا ہے کہ ''ان لوگوں کو دیکھیں، یہ لوگ کس کو پوج رہے ہیں؟ ایک ایسی ہستی کو جو انسانی خصائص رکھتی ہے۔ میں ایسے خدا پر یقین نہیں رکھتا۔

کچھ خدا کا غلط تصور رکھتے ہیں۔ ایک دہریہ اس تصور کو رد کرتا ہے لیکن میں بحیثیت مسلمان بھی اس غلط تصور کی تائید نہیں کرتا، میں بھی اس غلط تصورِ خدا کو رد کرتا ہوں۔ یہ "لا الٰہ" کا مرحلہ ہے۔ لیکن جس وقت میں یہاں تک اس سے اتفاق کرتا ہوں، اس وقت میرا فرض بنتا ہے کہ میں خدا کا صحیح اور درست تصور بھی اس کے سامنے پیش کروں۔ اللہ کے حقیقی تصور سے اسے آگاہ کروں۔

اچھا اب فرض کیجیے کہ ایک شخص غیر مسلم ہے بلکہ اسلام کا مخالف ہے۔ اس سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں اسلام کا اس لیے مخالف ہوں کہ:

یہ ایک ظالمانہ مذہب ہے......

یہ ایک بے رحمانہ مذہب ہے......

یہ مذہب دہشت گردی کی ترویج کرتا ہے......

یہ مذہب خواتین کے حقوق تسلیم نہیں کرتا......

یہ مذہب غیر سائنسی ہے......

اگر وہ مجھے بتاتا ہے کہ مذکورہ اسباب کی وجہ سے وہ اسلام کا مخالف ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ جس مذہب کی یہ خصوصیات ہوں میں خود اس کا مخالف ہوں، میں خود کسی ایسے مذہب کو تسلیم نہیں کرتا جو ظالمانہ ہو، جو خواتین کے حقوق غصب کرتا ہو لیکن میں اسے یہ بھی بتاؤں گا کہ یہ خصوصیات اسلام کی نہیں ہیں۔ میں اسلام کا صحیح تصور اس کے سامنے پیش کروں گا، اسے بتاؤں گا کہ اسلام تو رحم پر زور دینے والا مذہب ہے، دہشت گردی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذہب خواتین کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس کے بعد یقیناً وہ غیر مسلم، ان شاء اللہ، اسلام کو تسلیم کرے گا، یہ ہمارا فرض ہے کہ اسلام کا درست تصور لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی طرح خدا کا، اللہ تعالیٰ کا درست تصور بھی لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔

خدا کی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی، میرے خیال میں بہترین تعریف وہ ہے جو قرآنِ مجید میں بیان کردی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾ [الاخلاص : ٤-١]

''کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔''

مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی میں بتایا گیا ہے کہ؛

......خدا واحد و یکتا ہے، اکیلا ہے۔

......وہ بے نیاز ہے، ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

......وہ دنیاوی رشتوں سے پاک ہے، نہ اس کے والدین ہیں نہ اولاد۔ وہ ماں باپ اور بچوں جیسے رشتے نہیں رکھتا۔

......اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے، اس کا تقابل کسی سے نہیں ہوسکتا، اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اگر خدا کا کسی سے تقابل ''Comparison'' کیا جاسکے تو وہ خدا نہیں ہے۔

گویا یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک چہار سطری تعریف بیان کردی گئی ہے۔ اگر کسی کا تصورِ خدا اس تعریف کے مطابق ہے تو ہم مسلمانوں کو اس تصورِ خدا پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو جو خدائی کے امیدوار ہیں، انھیں سامنے آنا ہوگا، انھیں اس امتحان پر پورا اترنا ہوگا۔ خدائی کا امیدوار کون ہے؟ کون خدائی کا دعویٰ کرتا ہے؟

بعض لوگ گرو رجنیش کو، اوشو کو خدا سمجھتے ہیں۔ آیئے ہم اسے اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

خدا کی پہلی صفت، واحد یکتا ہونا ہے۔ کیا بھگوان رجنیش واحد و یکتا تھا؟ نہیں۔ اس جیسے ہزاروں لوگ موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں ہی اس جیسے بہت سے لوگ پائے جاتے

ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے رجنیش کا کوئی پیروکار اصرار کرے کہ نہیں گرو رجنیش منفرد تھا۔ وہ ایک ہی تھا۔ چلیں اسے ایک موقع دے دیتے ہیں اور دوسری صفت کی طرف بڑھتے ہیں۔ دوسری صفت بے نیاز ہونا ہے، اللہ صمد ہے، اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے۔

رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ دمے کا مریض تھا۔ اسے ذیابیطس بھی تھی۔ وہ اپنی بیماری تک دور نہ کرسکتا تھا۔ وہ آپ کی اور میری بیماری کیا دور کرے گا؟ جب وہ امریکہ گیا تو امریکی حکومت نے اسے گرفتار کرلیا تھا۔ ذرا اندازہ کیجیے' خدا قید میں ہے۔' کیا خدا کو قید کیا جاسکتا ہے؟ وہ جو خود کو آزاد نہیں کرواسکا، آپ کو اور مجھے کیا آزاد کروائے گا۔ ہمارے مسائل اور پریشانیاں کیا دور کرے گا؟

گرو رجنیش نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ تصور کیجیے! کیا خدا کو زہر دیا جاسکتا ہے؟

جب وہ یونان میں تھا تو یونان کے لاٹ پادری صاحب نے بیان دیا کہ اگر اس شخص کو یونان سے نہ نکالا گیا تو اس کے اور اس کے پیروکاروں کے مکانات تباہ کردیے جائیں گے۔ اور یونانی حکومت کو اسے جلاوطن کرنا پڑا۔ کیا یہ بے نیازی ہوتی ہے؟ کیا اسے صمدیت کہتے ہیں؟

تیسری صفت یہ ہے کہ خدا نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔ یعنی نہ وہ ماں باپ رکھتا ہے اور نہ اولاد۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ گرو رجنیش کے کتنے بچے تھے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ وہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جبل پور میں پیدا ہوا اور ۱۹ر جنوری ۱۹۹۰ء کو مرگیا۔ لیکن جب آپ پونہ میں اس کے مرکز میں جائیں تو وہاں تحریر ہے:

<u>بھگوان رجنیش</u>

''جو نہ کبھی پیدا ہوا، نہ کبھی مرا، اس نے ۱۱ر دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹ر جنوری

۱۹۹۰ء تک اس دنیا کا دورہ کیا۔"

لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ دنیا کے اکیس ممالک میں اسے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ وہ ان اکیس ممالک میں جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکا۔ اندازہ کیجیے خدا خود دنیا کے دورے پر آیا ہوا ہے اور اپنی دنیا کے اکیس ممالک میں جانا چاہتا ہے لیکن نہیں جا سکتا، کیا یہی خدا کا وہ تصور ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟

اور اب آخری شرط کہ خدا کا ہم سر یعنی اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی، اس کا کسی سے تقابل نہیں کیا جا سکتا، اگر آپ خدا کا تصور کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ خدا کی تجسیم ممکن نہیں ہے۔

جبکہ گرو رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ گرو رجنیش کے لمبے بال تھے، ایک لمبی لہراتی ہوئی داڑھی تھی، جس کا رنگ سفید تھا، اس نے ایک چوغہ سا پہنا ہوا ہوتا تھا۔ یعنی آپ بڑی آسانی سے اس کا تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو تصور میں آ جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

خدا کا کسی سے تقابل بھی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص بطورِ مثال کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے۔ آرنلڈ مسٹر یونیورس، طاقتور ترین انسان تھا۔ اسی طرح دارا سنگھ ایک طاقت ور پہلوان تھا۔ لیکن جس وقت آپ تقابل کریں گے، جس وقت آپ کہیں گے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے، دارا سنگھ سے، یا کنگ کانگ سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ کا تصورِ خدا ہی غلط ہے۔ خواہ آپ یہی کہہ رہے ہوں کہ خدا کسی سے ایک کروڑ گنا طاقتور ہے لیکن بہرحال آپ تقابل تو کر رہے ہوں گے اور خدا کی صفت یہ ہے کہ اس کا تقابل نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ ﴾

"اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔"

لہٰذا اب یہ بات میں اپنے معزز، دانش مند، سامعین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کے ذہن میں خدا کا کیا تصور ہے؟ اور کیا ان کا تصور ان شرائط پر پورا اترتا ہے؟ کیا ان کے اس تصور میں یہ چاروں خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے، اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو ہم مسلمانوں کو آپ کے تصورِ خدا پر کوئی اعتراض نہیں اور ہم اسے اللہ تعالیٰ تسلیم کرتے ہیں، بصورتِ دیگر فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یہ دلائل سننے کے بعد بھی بالعموم ایک دہریہ آپ کی بات قبول نہیں کرے گا۔ وہ کہے گا کہ میں ان دلائل کو نہیں مانتا۔ میں ایک ہی چیز کو حتمی مانتا ہوں اور وہ ہے سائنس۔

اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ لہٰذا آیئے ہم سائنسی علوم کی روشنی میں قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ دہریے یہی کہتے ہیں کہ ہم صرف اسی دعوے کو درست مانتے ہیں جو سائنس کی روشنی میں درست ثابت ہو۔ بصورتِ دیگر ہم خدا کو نہیں مانتے۔

میں ان تمام تعلیم یافتہ حضرات سے ایک سوال کرنا چاہوں گا جو خدا پر یقین نہیں رکھتے لیکن سائنس پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے ایک مشین آئے جس کے بارے میں آپ نے نہ کچھ سنا ہو، نہ پڑھا ہو، نہ ہی اسے کبھی دیکھا ہو تو آپ کے خیال میں وہ پہلا شخص کون ہوگا جو آپ کو اس مشین کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر سکے۔ یہ مشین ایک دہریے کے سامنے ہے جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے تو اس کے خیال میں کون ہوگا جو اس مشین کے نظامِ عمل کے بارے میں علم رکھتا ہو؟

میں نے یہ سوال سینکڑوں دہریے لوگوں سے، مذہب کے منکر لوگوں سے کیا ہے، تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے:

''شاید اس مشین کا بنانے والا ہی یہ معلومات دے سکتا ہے۔''

کچھ کہتے ہیں موجد، کچھ خالق کا لفظ استعمال کریں گے، کچھ تیار کنندہ کا۔ سینکڑوں لوگوں سے سوال کرنے کے بعد بھی مجھے ملتے جلتے جواب ہی ملے ہیں۔ بہر حال جواب کچھ

بھی ہو میں تسلیم کر لیتا ہوں۔ دوسرا شخص کون ہوگا؟ یہ وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جسے خالق نے بتایا ہو اور کوئی ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو اپنی تحقیق سے درست نتائج تک پہنچ گیا ہو لیکن پہلا بہرصورت وہی ہوگا جو اس مشین کا خالق ہے، موجد ہے، تیار کنندہ ہے، بنانے والا ہے۔

اب میں اس دہریے سے، منکرِ خدا سے، جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے ایک اور سوال کرتا ہوں کہ بتاؤ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟

وہ جواب دیتا ہے کہ دراصل پہلے صرف مادے کا ایک مجموعہ تھا جسے پرائمری نیبولا (Primary Nebula) کہتے ہیں۔ پوری کائنات یہی تھی۔ پھر ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا۔ جس کے نتیجے میں ثانوی تقسیم ہوئی اور کہکشائیں وجود میں آئیں۔ ستارے اور سیارے بنے۔ اور یہ زمین بھی وجود میں آئی جس پر ہم رہ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ جنوں پریوں کی کہانیاں تم نے کہاں سے سنی ہیں؟ وہ کہتا ہے ''نہیں، یہ جنوں پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ تو سائنسی حقائق ہیں جو کل ہی ہمارے علم میں آئے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں '' کل'' سے مراد نصف صدی یا ایک صدی کا عرصہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے کہ دو سائنسدانوں کو ''عظیم دھماکے کا نظریہ Big Bang Theory دریافت کرنے پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔''

میں کہتا ہوں بالکل ٹھیک۔ تمہاری ہر بات سے مجھے اتفاق ہے، لیکن اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ یہ بات قرآن میں آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہی بیان فرما دی گئی تھی۔ سورۂ انبیاء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۰]

''یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟

میرا قرآن آج سے چودہ صدیاں پیش تر نازل ہوا تھا۔ اس بات کے کافی ثبوت

موجود ہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو ۱۴۰۰ سال پہلے موجود تھی۔ تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ اس میں عظیم دھماکے کے نظریے کی طرف اشارہ موجود ہے؟

اس آیت میں انتہائی اختصار کے ساتھ Big Bang Theory موجود ہے۔ تم کہتے ہو یہ نظریہ سو یا پچاس سال پہلے سامنے آیا ہے تو پھر قرآن میں اس کا ذکر کہاں سے آ گیا؟

لا مذہب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ''شاید کسی نے اندازہ لگایا ہوگا۔'' میں بحث نہیں کرتا، ان کی بات مان لیتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ زمین جس پر ہم رہ رہے ہیں، اس کی شکل کیسی ہے؟ جواب ملتا ہے کہ پہلے تو لوگ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے اور اسی لیے وہ طویل سفر سے گھبراتے بھی تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زمین کے کنارے پر پہنچ کر نیچے گر پڑیں۔ لیکن آج ہمارے پاس اس بات کے کافی سائنسی ثبوت موجود ہیں کہ زمین چپٹی نہیں ہے۔ زمین دراصل گول یعنی کرے کی شکل میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں یہ بات آپ کو کب معلوم ہوئی؟

جواب ملتا ہے، ماضی قریب میں، سو سال پہلے، دو سو سال پہلے اور اگر جواب دینے والا صاحب علم ہو تو اس کا جواب ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ بات ثابت کی تھی وہ سر فرانسس ڈریک تھا، جس نے ۱۵۹۷ء میں یہ ثابت کیا کہ زمین کروی ہے۔

میں اسے کہتا ہوں کہ سورۂ لقمان کی اس آیت کا تجزیہ کرے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ [لقمان: ۲۹]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں اور (کیا تم نہیں جانتے کہ) جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

پردتے ہوئے لانے سے مراد ہے ایک سست رو اور بتدریج تبدیلی۔ یعنی رات آہستہ آہستہ، بتدریج دن میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے اور رات دن میں۔ یہ عمل اس طرح ہونا ممکن ہی نہیں اگر زمین چپٹی ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین کی شکل کروی ہو۔ اسی طرح کا ایک پیغام ہمیں قرآنِ مجید کی سورۃ الزمر میں بھی ملتا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ ﴾ [الزمر: ۵]

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو! وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔''

دن کو رات پر لپیٹنے اور رات کو دن پر لپیٹنے کا یہ عمل بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین گول یعنی کرہ نما ہو۔ زمین کے چپٹے ہونے کی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ مجھے بتاتے ہیں کہ یہ بات ۱۵۹۷ء میں سامنے آئی تھی تو پھر قرآنِ عظیم میں یہ بات ایک ہزار چار سو سال پہلے کس طرح موجود تھی؟

ہوسکتا ہے وہ کہیں کہ یہ بھی اتفاق تھا، محض ایک اتفاق، ایک اندازہ جو درست ثابت ہوا۔ میں یہاں بھی بحث نہیں کرتا اور آگے بڑھتا ہوں۔

میرا اگلا سوال یہ ہوگا کہ چاند سے جو روشنی ہم تک پہنچتی ہے یہ کس چیز کی روشنی ہوتی ہے؟ وہ مجھے بتائے گا کہ پہلے ہم یہی سمجھتے تھے کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج جب کہ سائنس ترقی کر چکی ہے، آج ہم جانتے ہیں کہ دراصل یہ سورج کی روشنی ہوتی ہے جو چاند سے منعکس ہو کر زمین تک آتی ہے۔ چاند خود سے روشن نہیں ہے۔

اس کے بعد میں اس سے ایک اور سوال کروں گا۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید کی سورۃ

فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک قمرِ منیر روشن کیا۔''

عربی میں چاند کے لیے لفظ ''قمر'' استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی روشنی کے لیے لفظ ''منیرا'' استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد منعکس یا منعطف روشنی ہوتی ہے ''نور'' کا لفظ ایسی ہی روشنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تم کہتے ہو کہ یہ حقیقت تم نے آج دریافت کی ہے، تو پھر بتاؤ، قرآن میں یہ بات ۱۴۰۰ سال پہلے کس طرح موجود تھی؟ وہ فوری جواب نہیں دے سکے گا، اسے کچھ دیر سوچنا پڑے گا اور شاید بالآخر اس کا جواب یہی ہوگا کہ غالباً یہ بھی محض اتفاق ہے، اندازہ ہے یا ''تکا لگ گیا ہے۔''

میں اس سے پھر بھی بحث نہیں کروں گا۔ گفتگو آگے چلانے کے لیے میں بحث سے گریز کروں گا۔ میں کہوں گا کہ اگر تمھارا جواب یہی ہے تو میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ اور بات آگے بڑھاتا ہوں۔

میں اسے کہتا ہوں کہ میں نے ۱۹۸۲ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس وقت ہمیں بتایا گیا تھا کہ سورج ساکن ہے یعنی اپنے مرکز کے گرد تو مسلسل حرکت کر رہا ہے، گھوم رہا ہے، لیکن اپنے مقام کے لحاظ سے ساکن ہے۔ ہوسکتا ہے وہ پوچھے کہ کیا قرآن بھی یہی کہتا ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ نہیں۔ یہ بات تو ہمیں سکول میں بتائی گئی تھی، میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا واقعی اسی طرح ہے؟

وہ کہے گا کہ نہیں۔ آج سائنس ترقی کر چکی ہے۔ اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد گھومنے کے علاوہ مداری حرکت بھی کر رہا ہے۔ سورج کی مرکز کے گرد حرکت کا

آپ مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں، اگر آپ کے پاس ضروری آلات موجود ہوں۔ سورج کی سطح پر سیاہ دھبے موجود ہیں اور ان دھبوں کی حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد ایک چکر تقریباً پچیس دن میں پورا کر لیتا ہے۔ لیکن اس حرکت کے علاوہ سورج ایک مدار میں بھی حرکت کر رہا ہے۔

کیا قرآن کہتا ہے کہ سورج ساکن ہے؟ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں اس موقع پر ہنسنے لگے۔

لیکن پھر میں بتاتا ہوں کہ نہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ ﴾ [الانبیآء: ۳۳]

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

قرآن بتا رہا ہے کہ سب ایک فلک میں، ایک مدار میں حرکت کر رہے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات جدید سائنس نے حال ہی میں دریافت کی ہے تو پھر قرآن میں یہ بات چودہ سو سال پہلے ہی کس طرح بیان کر دی گئی تھی؟

وہ تھوڑی دیر تک خاموش ہی رہتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کہتا ہے کہ عرب علم فلکیات کے ماہر تھے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے عربوں میں سے کسی نے یہ بات تمہارے پیغمبر ﷺ سے کی ہو اور انھوں نے اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہو!

میں مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں کہ عرب علم فلکیات میں انتہائی ترقی یافتہ تھے لیکن ساتھ ہی میں اسے یاد دلاتا ہوں کہ وہ تاریخ کو گڈمڈ کر رہا ہے۔ کیوں کہ عربوں کا فلکیات میں ترقی کرنا بہت بعد کی بات ہے اور قرآن ان سے صدیوں پہلے نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ دراصل عربوں کے فلکیات میں ترقی کرنے کا سبب ہی قرآن تھا۔ علم فلکیات عربوں سے قرآن میں نہیں آیا، قرآن سے عربوں نے سیکھا تھا۔ قرآن بہت سے سائنسی حقایق کا ذکر کرتا ہے۔

جغرافیے کے حوالے سے اور پھر ''آبی چکر'' (Water Cycle) کے حوالے سے دیکھیے تو قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ [الزمر: ۲۱]

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعے سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔''

قرآن آبی چکر کا ذکر متعدد آیات میں کرتا ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ پانی سمندروں کی سطح سے بخارات بن کر اٹھتا ہے۔ بادلوں میں تبدیل ہوتا ہے۔ بادل بالآخر کثیف ہو جاتے ہیں، ان میں بجلیاں چمکتی ہیں اور ان سے بارش ہوتی ہے۔ اس مظہر کا ذکر قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ۱۸]

''اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

سورۂ روم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ ﴾ [الروم: ۴۸]

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے،

پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو وہ یکا یک خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ [النور: ٤٣]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔''

سورۂ روم میں فرمایا گیا:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

[الروم: ٢٤]

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یعنی قرآن متعدد مقامات پر آبی چکر کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ جب کہ یہ آبی چکر (Water Cycle) ایک سائنسدان نے جس کا نام Bernard Palacy تھا، ۱۵۸۰ء میں بیان کیا تھا۔ جو آبی چکر سائنس ۱۵۸۰ء میں دریافت کر رہی ہے وہ قرآن میں اس سے ہزار سال پہلے ہی موجود تھا؟ کیسے؟

اب ہم ''ارضیات'' کی جانب آتے ہیں۔ علم ارضیات میں ایک تصور بیان کیا جاتا

ہے جسے Folding کہتے ہیں۔ جس زمین پر ہم رہتے ہیں اس کی بیرونی پرت یا سطح خاصی باریک ہے۔ اس سطح میں بل پڑنے کے سبب پہاڑی سلسلے وجود میں آتے ہیں جو سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ اب میں اس دہریے کو بتاتا ہوں کہ قرآنِ مجید کی سورۂ نبا میں بتایا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا o وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا o ﴾ [النباء: ٦۔٧]

”کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔“

قرآن کہتا ہے کہ پہاڑوں کو میخیں بنایا گیا ہے۔ اوتاد عربی میں اس میخ کو کہا جاتا ہے جو خیمہ کھڑا کرنے کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ اور جدید سائنس بھی پہاڑوں کا اسی طرح کا کردار بیان کرتی ہے۔

یعنی پہاڑوں کی مثال خیموں کی میخوں کی سی ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ o ﴾ [الانبیآء: ٣١]

”اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کرلیں۔“

گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ زمین ڈھلکنے سے محفوظ رہے۔

مزید برآں میرے پوچھنے پر وہ دہریہ کہے گا کہ اس کے علم میں ہے کہ سمندر میں میٹھا اور کھارا پانی بعض جگہوں پر الگ الگ رہتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک روک موجود ہوتی ہے۔ ایک آڑ موجود ہوتی ہے جو دونوں طرح کے پانی کو ملنے نہیں دیتی اور الگ الگ رکھتی ہے۔ مَیں اُسے سورۂ فرقان کی یہ آیت سناتا ہوں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ

﴿ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ۝ ﴾ [الفرقان: ۵۳]

”اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔“

اسی طرح کی بات سورۂ رحمان میں بھی کی گئی ہے:

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ۝ ﴾

[الرحمٰن: ۲۰۔۱۹]

”دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔“

آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ بعض مقامات پر سمندر میں میٹھا اور کھاری پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے، ان کے درمیان ایک روک موجود رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں وہ اس موقع پر کہے کہ ”شاید کسی عرب نے سمندر میں غوطہ لگا کر اس روک کو دیکھ لیا ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا ہوگا، یوں یہ بات قرآن میں آ گئی ہوگی۔“

لیکن بات یہ ہے کہ جس روک یا آڑ کا یہاں ذکر یہاں ہو رہا ہے، وہ نظر تو آتی ہی نہیں۔ یہ تو ایک نادیدہ رکاوٹ ہے۔ اسی لیے قرآن اس کے لیے ”برزخ“ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

یہ مظہر انتہائی واضح طور پر ”کیپ ٹاؤن“ کے قریب دیکھا جاسکتا ہے۔ یعنی افریقہ کے انتہائی جنوب میں۔ مصر میں بھی جہاں دریائے نیل سمندر سے ملتا ہے، یہی صورتِ حال ہوتی ہے۔ اسی طرح خلیج عرب میں جہاں ہزاروں کلومیٹر تک دونوں طرح کا پانی موجود ہے، لیکن الگ الگ رہتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاّقی کو) نہیں مانتے؟''

آپ ذرا تصور کیجیے کہ عرب کے صحراؤں میں جہاں پانی کی شدید قلت ہوتی ہے، وہاں یہ بات کہی جارہی ہے۔ وہاں کس کو یہ خیال آسکتا تھا کہ ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر انھیں اندازہ لگانا ہی ہوتا تو وہ ہر چیز کا اندازہ لگا سکتے تھے، انھیں کسی بھی چیز کا خیال آسکتا تھا، سوائے پانی کے۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ہر زندہ چیز خلیوں سے بنی ہے۔ ان خلیات کا بنیادی جزو سائٹو پلازم Cytoplasm ہوتا ہے جو کہ اسی فی صد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر زندہ چیز پچاس سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آج سے چودہ صدیاں پیش تر، یہ بات قرآنِ حکیم میں کیوں کر بیان کردی گئی تھی؟ اب وہ دہریہ بھی چپ ہو چکا ہوگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہوگا۔

شماریات کا ایک نظریہ ہے جسے Theory of Probability کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے دو ممکنہ جوابات ہوسکتے ہیں۔ ایک صحیح اور ایک غلط۔ اگر آپ محض اندازے سے جواب دیں تو پچاس فی صد امکان ہے کہ آپ کا جواب درست ہوگا۔ مثال کے طور پر جب آپ ٹاس کرتے ہیں تو دونوں طرف پچاس پچاس فی صد امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ دو دفعہ ٹاس کریں تو اس بات کا کتنا امکان ہے کہ دونوں مرتبہ ہی آپ کا جواب درست ہوگا۔ پہلی مرتبہ پچاس فی صد یعنی دو میں سے ایک اور دوسری مرتبہ پچاس فی صد کا پچاس فی صد یعنی چار میں سے ایک امکان یا

یوں کہیے کہ پچیس فی صد امکان ہے کہ آپ دونوں مرتبہ درست جواب دیں گے۔

فرض کیجیے میں ایک پانسہ Dice پھینکتا ہوں جس کے چھ رخ ہے۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، اور ۶۔ اب اگر میں اندازہ لگاؤں تو اس اندازے کے درست ہونے کا امکان چھ میں سے ایک ہوگا۔ اب اگر میں دو دفعہ ٹاس کروں اور ایک دفعہ پانسہ پھینکوں تو یہ امکان کتنا ہے کہ ہر دفعہ میں جواب درست ہوگا؟

یہ امکان ہوگا، ۲/۱ ضرب ۲/۱ ضرب ۶/۱ یعنی ۲۴/۱ یا دوسرے لفظوں میں چوبیس میں ایک امکان یہ ہے کہ میرا جواب ہر بار درست ہوگا۔

آیئے یہ نظریہ (Theory of Probability) قرآن پر لاگو کر کے دیکھتے ہیں۔ محض گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ قرآن میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ محض اندازے ہیں جو درست ثابت ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان اندازوں کے درست ہونے کا امکان کتنا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ زمین گول یعنی کرہ نما ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ زمین کی شکل کے بارے میں کیا اندازے لگائے جاسکتے ہیں؟ کسی شخص کے ذہن میں زمین کی کون سی ممکنہ شکلیں آسکتی ہیں؟

کہا جاسکتا ہے کہ زمین چپٹی ہے یا تکون ہے یا چوکور ہے یا شش پہلو ہے یا ہشت پہلو ہے، اسی طرح بہت سی ممکنہ شکلیں سوچی جاسکتی ہیں، ذہن میں آسکتی ہیں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ صرف تیس ممکنہ شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض اندازہ لگاتا ہے تو اس اندازے کے درست ثابت ہونے کا امکان ۳۰ میں سے ایک ہوگا۔

چاند کی روشنی یا تو اس کی اپنی ہوگی یا منعکس ہوگی لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں اور یہاں اندازہ درست ثابت ہونے کا امکان دو میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ امکان کہ ایک شخص کے دونوں اندازے درست ثابت ہوں گے، ساٹھ میں ایک ہے۔

اچھا، اب یہ بتایئے کہ صحرائے عرب میں رہنے والا شخص کیا اندازہ لگائے گا کہ انسان

بلکہ تمام جاندار کس شے سے بنے ہوئے ہیں؟ اور اندازہ بھی صحرا کے رہنے والے شخص نے ہی لگانا ہے تو اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے اس کا جواب ریت ہو، یا لکڑی یا لوہا یا کوئی اور دھات یا کوئی گیس یا تیل۔ وہ شخص دس ہزار اندازے لگا سکتا ہے اور اس کا آخری اندازہ پانی ہوگا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر زندہ مخلوق پانی سے بنائی گئی ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ﴾ [النور: ۴۵]

''اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔''

یہ بات اگر محض اندازے سے کی جائے تو اندازہ درست ہونے کا امکان دس ہزار میں ایک ہوگا۔ اب یہ امکان کہ ایک شخص مذکورہ بالا تینوں معاملات میں اندازے سے جواب دے اور ہر بار اس کا اندازہ درست ثابت ہو، چھ لاکھ میں سے ایک ہے۔ یعنی ۰۰۰۱۷ء۰ فی صد۔ اب میں یہ آپ حاضرین پر چھوڑتا ہوں کہ اس کے بعد آپ Theory of Probability کا اطلاق قرآن پر کرنا چاہیں گے یا نہیں۔

قرآن ایسے سینکڑوں حقائق کا ذکر کرتا ہے جو اس وقت یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں لوگوں کے علم میں نہیں تھے۔ اگر ان تمام بیانات کو اندازے فرض کیا جائے تو ان اندازوں کے بیک وقت درست ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ اور Probability کے نظریے کی رو سے تو یہ امکان صفر ہی رہ جاتا ہے۔

یہاں کچھ لوگ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ ''ذاکر صاحب کیا آپ قرآن کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟'' لہٰذا میں یہ یاددہانی ضروری سمجھتا ہوں کہ ''قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ یہ سائنز کی کتاب ہے۔ یعنی؛

Quran is not a book of Science

It is a Book of SIGN'S.

یعنی یہ نشانیوں کی، آیات کی کتاب ہے، اس کتاب میں چھ ہزار آیات موجود ہیں۔

جن میں سے ایک ہزار سے زائد آیات ایسی ہیں جن کا تعلق سائنسی علوم سے ہے۔ میں سائنس کو قرآن کے اثبات کے لیے استعمال نہیں کر رہا کیوں کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو کسی پیمانے کی، کسی معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے لیے آخری پیمانہ اور حتمی معیار خود قرآن ہے۔ قرآن ہی ہمارے لیے فرقان یعنی حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اسی پیمانے پر ہم یعنی مسلمان صحیح اور غلط بیان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن ایک دہریے کے لیے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے جو خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اس کے لیے معیار کیا ہے؟ اس کے لیے تو آخری پیمانہ سائنس ہی ہے۔ لہٰذا میں اپنی بات اس کے سامنے اسی کے پیمانے سے درست ثابت کر رہا ہوں۔ البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سائنسی نظریات بسا اوقات تبدیل بھی ہو جایا کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے صرف ثابت شدہ سائنسی حقائق ہی کو سامنے رکھا ہے۔ میں نے محض نظریات اور مفروضوں کی بنیاد پر بات نہیں کی۔ یعنی ایسے نظریات کو دلیل نہیں بنایا جن کی بنیاد مفروضوں پر ہے۔ میں نے اس کو یہ بتایا ہے کہ جو چیز تمھارے معیار اور پیمانے نے آج سے سو یا پچاس برس پہلے ثابت کی ہے قرآن اسے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کر رہا تھا۔ لہٰذا بالآخر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن ہی برتر ہے۔ سائنس اور قرآن میں سے برتری قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن متعدد سائنسی حقائق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ۵۳]

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بنایا اور اس میں تمہارے چلنے کو

راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے نباتات کے جوڑے نکالے۔"

• آپ یہ بات ماضی قریب میں دریافت کر رہے ہیں کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔اسی طرح سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَٰئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ ﴾

[الانعام: ۳۸]

" زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔"

سائنس اس بات کا اثبات کچھ ہی عرصہ قبل کر رہی ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں بتایا گیا ہے کہ شہد کی مکھی شہد بنانے کے لیے رس جمع کرتی ہے۔ یہاں اس کے لیے مونث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔یعنی یہ کام نر مکھی نہیں کرتی بلکہ مادہ مکھی کرتی ہے۔ سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے، ورنہ پہلے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ کام نر مکھی کرتی ہے۔ یہ مکھیاں صرف نو دریافت شدہ پودوں اور پھولوں کی اطلاع دیگر مکھیوں کو دیتی ہیں۔

سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ﴾

[العنکبوت: ۴۱]

"اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر، مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔"

یہاں بات محض مکڑی کے گھر یعنی جالے کی ظاہری کمزوری کے حوالے سے نہیں کی

جارہی۔ یہ آیت مکڑی کی گھریلو زندگی کی خصوصیت بھی بیان کر رہی ہے کہ تعلقات کے لحاظ سے بھی سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات مادہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے۔

اسی طرح سورۂ نمل کی آیت نمبر ۱۷ اور ۱۸ میں چیونٹیوں کے باتیں کرنے کا ذکر ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ تو جنوں پریوں کی کہانیوں والی بات ہے۔ کیا چیونٹیاں بھی آپس میں بات کر سکتی ہیں؟

لیکن آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ حیوانات میں سے چیونٹیوں کا طرزِ زندگی انسانی طرزِ زندگی کے قریب ترین ہے۔ یعنی انسانی طرزِ حیات سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ چیونٹیوں میں مردہ چیونٹیوں کو دفنانے کی عادت بھی موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے درمیان رابطے کا ایک مکمل نظام موجود ہوتا ہے۔ ان کے درمیان پیغامات کی ترسیل کا ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ ﴾

[النحل: ٦٩]

”اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔“

اس آیت قرآنی میں فرمایا گیا کہ شہد میں انسانوں کے لیے شفا رکھی گئی ہے اور آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ شہد میں جراثیم کش خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی فوجی دورانِ جنگ اپنے زخموں پر شہد لگاتے رہے۔ اور نہ صرف ان کے زخم مندمل ہو جاتے تھے بلکہ زخم کا نشان بھی بہت کم باقی رہتا تھا۔ بعض اقسام کی الرجی کے علاج کے لیے شہد آج بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح قرآن دورانِ خون اور دودھ کی افزائش کے حوالے سے بھی بات کرتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت نمبر ۶۶ اور سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۲۱ میں یہ ذکر موجود ہے اور نزول قرآن کے چھ سو سال بعد ابن نفیس نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا۔ مغربی دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو نزول قرآن کے ایک ہزار سال بعد Harvey نامی سائنس دان نے یہ نظریہ عام کیا۔

قرآن علم الجنین کے بارے میں بھی بات کرتا ہے۔ قرآنِ مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات، سورۂ علق کی درجِ ذیل آیات تھیں۔

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ ﴾

[العلق: ۲۔۱]

''پڑھو (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

''علقۃ'' کا ترجمہ خون کا لوتھڑا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس لفظ کا مطلب ''چپکنے والی چیز'' اور ''جونک نما چیز'' بھی ہوتا ہے۔ یہ آیت اور قرآن میں موجود علم الجنین کے حوالے سے موجود دیگر بیانات پروفیسر کیتھ مور کو دکھائے گئے تھے۔ پروفیسر صاحب کا تعلق ٹورنٹو، کینیڈا سے ہے اور وہ اس شعبے کے اعلیٰ ترین ماہرین میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔

کچھ عرب حضرات نے اس قرآنی ہدایت پر عمل کیا کہ ''اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں'' اور وہ پروفیسر کیتھ مور کے پاس چلے گئے۔ یہ سارا لوازمہ ان کے سامنے رکھا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ تمام باتیں ٹھیک ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ قرآنی بیانات میں سے بیش تر تو جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں سو فی صد درست ہیں لیکن بعض بیانات ایسے ہیں، جن کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ انھیں خود اس بارے میں مکمل علم حاصل نہیں ہے۔

ان آیات میں سے ایک آیت وہ تھی جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''ہم نے انسان کو ایک جونک نما شے سے تخلیق کیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب اپنی تجربہ گاہ میں گئے۔ انھوں نے جونک کی

تصاویر کا تقابل جنین کے بالکل ابتدائی مراحل کے ساتھ کیا۔ طاقتور خوردبین سے تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بالکل ابتدائی مراحل کے جنین اور جونک میں واقعی مشابہت پائی جاتی ہے۔

لہٰذا انھوں نے یہ بیان دیا کہ جو کچھ قرآن میں فرمایا گیا ہے، وہ صحیح اور درست ہے۔ یہی نہیں، پروفیسر مور نے آیاتِ قرآنی سے اخذ کردہ یہ معلومات اپنی کتاب ''The Developing Human.'' کے تیسرے ایڈیشن میں شامل کیں۔ اس کتاب کو اس سال کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا۔ ڈاکٹر مور نے یہ بھی تسلیم کیا کہ علم الجنین کے حوالے سے قرآن جو معلومات فراہم کرتا ہے، جدید سائنس نے وہ باتیں حال ہی میں دریافت کی ہیں۔ کیوں کہ علم الجنین تو علم طب کی جدید ترین شاخوں میں سے ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ باتیں کسی انسان کے علم میں آج سے چودہ سو برس پہلے موجود ہوں۔ لہٰذا قرآن لازماً ایک الہامی کتاب ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ٥ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ٥ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ٥ ﴾ [الطارق: ۵-۷]

''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

اور آج جدید علم الجنین ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدائی مراحل میں جنسی اعضاء یعنی فوطے اور رحم وغیرہ اس مقام سے بنتے ہیں جہاں گردے ہوتے ہیں یعنی ریڑھ کی ہڈی اور گیارھویں بارھویں پسلی کے درمیان۔

سورۂ نجم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ٥ ﴾

[النجم: ۴۵-۴۶]

”اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے، جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔“

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ٥ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ٥ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ ﴾ [القیٰمۃ: ۳۹-۳۷]

”کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔“

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی جنس کا تعین نطفہ کرتا ہے۔ یعنی مرد بچے کی جنس کا ذمہ دار ہوتا۔ جدید سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جنین تین اندھیروں یا تین تہوں کے اندر ہوتا ہے۔ اور جدید تحقیقات بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں۔

جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کا ذکر بھی قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥ ﴾ [المومنون: ۱۴-۱۲]

”ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاری گروں سے اچھا کاری گر۔“

سورۂ حج میں بھی یہ مراحل بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿ يَآيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ [الحج: ٥]

''لوگو، اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں، ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ ﴾

[السجدہ: ۹]

''پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں۔''

الدھر میں دوبارہ ارشاد ہوا:

﴿ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴾ [الدھر: ٢]

''ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔''

مذکورہ بالا دونوں آیاتِ قرآنی میں سننے کی صلاحیت کا ذکر" دیکھنے کی صلاحیت" یعنی بصارت سے پہلے آیا ہے۔ آج کا جدید علم طب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ سماعت کی قوت پہلے آتی ہے اور بصارت کی بعد میں، سماعت کا نظام پانچویں مہینے میں بن چکا ہوتا ہے جبکہ بصارت ساتویں ماہ میں مکمل ہوتی ہے۔

لوگوں نے سوال کیا کہ مرنے کے بعد تو انسان کی ہڈیاں بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو چکی ہوں گی تو پھر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انسان کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا؟

جواب میں فرمایا گیا:

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝ ﴾ [القیمة: ۳-۴]

" کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔"

مندرجہ بالا آیت میں ہڈیوں کے ساتھ انگلیوں کی پوروں کا ذکر کیوں فرمایا گیا ہے؟ قرآن کا بیان ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انگلیوں کی پوریں بھی ٹھیک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہے۔ یہ ذکر کیوں کیا جارہا ہے؟

۱۸۸۰ء میں انگلیوں کے نشانات Finger Prints کی مدد سے لوگوں کی شناخت کا طریقہ دریافت ہوا۔ یہ طریقہ کار آج بھی لوگوں کی شناخت کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ کیوں کہ لاکھوں کروڑوں لوگوں میں کوئی دو انسان بھی ایسے نہیں ہوتے جن کی انگلیوں کے نشانات یکساں ہوں۔

اور قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اس طرف اشارہ دے رہا ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں مزید پیش کی جاسکتی ہیں۔ اگر آپ قرآن اور سائنس کے حوالے سے مزید تفصیلات جاننا چاہیں تو میری کتاب "Quran & Modern Science" [1] سے

---

[1] اس کتاب کا اردو ترجمہ "قرآن اور سائنس" کے نام سے دارالنوادر کی جانب سے شائع کیا جاچکا ہے۔

رجوع کر سکتے ہیں۔

میں صرف ایک مثال مزید پیش کرنا چاہوں گا۔ تھائی لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک سائنس دان تھے، جن کا نام تھا Prof-Thagada Shaun انھوں نے درد اور درد محسوس کرنے والے اعضا کے حوالے سے کافی تحقیقات کی ہیں۔ قبل ازیں خیال یہی تھا کہ درد محسوس کرنے کا عمل ایک دماغی عمل ہے۔ یعنی دماغ اعصاب کی مدد سے درد محسوس کرتا ہے۔ لیکن حال ہی میں دریافت ہوا ہے کہ درد محسوس کرنے کے عمل میں جلد بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جلد میں Pain Receptors ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان درد محسوس کرتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نسا میں فرمایا گیا:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ط ﴾ [النساء: ۵۶]

’’جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے۔ اور جب ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تا کہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔‘‘

قرآن کی یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ جلد کا درد محسوس کرنے کے عمل سے براہِ راست تعلق ہے۔ یعنی یہاں Pain Receptors کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

ڈاکٹر تھاگاڈا کو جوب اندازہ ہوا کہ یہ کتاب آج سے ۱۴۰۰ سال قبل ہی یہ معلومات فراہم کر رہی تھی تو انھوں نے صرف اس ایک دلیل کی بنیاد پر قاہرہ میں ایک طبی کانفرنس کے دوران اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور برسرِ عام کہہ دیا:

((لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ط))

’’اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔‘‘

اب اگر ایک دہریے سے پوچھا جائے کہ یہ تمام معلومات قرآن میں کہاں سے آ گئی ہیں تو اس کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ اس کے پاس ایک ہی جواب ہوگا۔ وہی جواب جو

ہمارے پہلے سوال کا تھا۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ایک نامعلوم مشین کے بارے میں معلومات کس سے مل سکتی ہیں؟ جواب تھا۔ بنانے والے سے، خالق سے۔

قرآن میں یہ سارے حقائق بیان کرنے والا بھی اس کائنات کا خالق، اس کا بنانے والا اس کا ایجاد کرنے والا ہی ہے۔ جس کے لیے انگریزی میں GOD کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور عربی میں بہتر طور پر اللہ کا لفظ مستعمل ہے۔

Francis Beacon نے بجا طور کہا تھا:

''سائنس کا نامکمل علم آپ کو ملحد بنا دیتا ہے لیکن سائنس کا وسیع اور عمیق مطالعہ آپ کو خدا پر ایمان رکھنے والا بنا دیتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ آج کا سائنسدان جھوٹے خداؤں کو تو ردّ کر چکا ہے یعنی لا الہ کے مقام پر تو پہنچ چکا ہے لیکن ''الا اللہ'' کی منزل تک نہیں پہنچ پایا۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام قرآنِ مجید کی اس آیت پر کرنا چاہوں گا:

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ ﴾ [حٰمٓ السجدہ : ۵۳]

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ




حصہ دوئم
سوالات وجوابات

سوال:...... مسلمان، خدا کو اللہ کہہ کر کیوں پکارتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ مسلمان خدا کے لیے لفظ ''اللہ'' کیوں استعمال کرتے ہیں؟ اپنی گفتگو کے دوران میں نے قرآنِ مجید کی سورۂ اخلاص سے اللہ کی تعریف آپ کے سامنے پیش کی تھی۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [الاخلاص: ٤-١]

''کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔''

لیکن قرآنِ مجید میں یہ بھی فرمادیا گیا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ [بنی اسرائیل: ١١٠]

''اے نبیؐ! ان سے کہو ''اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔''

یعنی ہر اچھا نام اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یہ بات قرآنِ مجید میں دیگر متعدد مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۚ﴾ [الاعراف: ١٨٠]

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اسے اچھے ناموں ہی سے پکارو۔''

﴿ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾

[الحشر: ٢٤]

''وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝﴾ [طٰہٰ: ٨]

''وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

گویا تمام بہترین نام اللہ ہی کے لیے ہیں لیکن ایک تو یہ نام خوبصورت ہونے چاہئیں اور دوسرے ان ناموں کو سن کر آپ کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بنی چاہیے۔ یعنی ان ناموں میں تجسیم کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ مسلمان لفظ اللہ کو انگریزی لفظ GOD کے مقابلے میں ترجیح کیوں دیتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے عربی لفظ ''اللہ'' ایک خالص اور منفرد لفظ ہے۔ جب کہ انگریزی لفظ ''گاڈ'' کی یہ صورت نہیں۔ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ممکن ہے۔ اگر آپ لفظ کے آخر میں حرف ''S'' لگا دیں تو یہ GODS بن جاتا ہے یعنی جمع کا صیغہ لیکن عربی لفظ ''اللہ'' کی کوئی جمع نہیں ہے۔ لہٰذا بہت سے خداؤں کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اللہ ایک ہی ہے۔

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ [الاخلاص : ۱]

''کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔''

اسی طرح اگر آپ انگریزی لفظ GOD کے آخر میں ''ESS'' کا اضافہ کر دیں تو یہ ایک اور لفظ GODESS بن جائے گا۔ یعنی ''مونث خدا''۔ جب کہ عربی لفظ اللہ کے ساتھ تذکیر و تانیث کا کوئی تصور وابستہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جنس کے تصور سے پاک ہے۔ انگریزی لفظ کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ اسے بڑے ''G'' سے لکھیں گے تو اس کا مطلب خدا ہوگا لیکن اگر آپ اسے چھوٹے ''g'' سے لکھیں گے تو پھر اس کا مطلب ''دیوتا'' یا ''جھوٹے خدا'' ہوگا۔

اسلام میں صرف ایک ہی معبودِ حقیقی یعنی اللہ کا تصور موجود ہے۔ ہم کسی دیوتا وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔

اگر آپ لفظ God کے بعد Father کا اضافہ کر دیں تو یہ Godfather بن جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''فلاں میرا گاڈ فادر ہے'' یعنی فلاں میرا سرپرست ہے۔ لیکن لفظ اللہ

کے ساتھ اس نوع کا کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ ''اللہ ابا'' یا ''اللہ باپ'' جیسا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ God کے بعد Mother کا اضافہ کریں تو لفظ Godmother بن جائے گا۔ اس قسم کا کوئی لفظ بھی اسلام میں نہیں پایا جاتا۔

لفظ God سے قبل Tin لگا دیا جائے تو یہ Tingod بن جاتا ہے جس کے معنی ہیں جھوٹے خدا یا جعلی خدا۔ لیکن لفظ اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی سابقہ یا لاحقہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ واحد و یکتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں لیکن یہ نام خوبصورت ہونا چاہیے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... ارون شوری نے لکھا ہے کہ قرآنِ مجید کی چوتھی سورۃ کی گیارھویں بارھویں آیت میں ورثا کے حصے بیان کرتے ہوئے جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اگر آپ ان تمام حصوں کو جمع کریں تو حاصل جمع ایک سے زیادہ آتا ہے۔ بقول ارون شوری اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو ریاضی نہیں آتی تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ وضاحت فرمائیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میرے بھائی نے سوال یہ پوچھا ہے کہ ارون شوری کا دعویٰ ہے کہ ''قرآنِ پاک کی سورۂ نسا کی آیت گیارہ اور بارہ میں بیان کردہ ورثا کے حصوں کو اگر جمع کیا جائے تو جواب ایک سے زیادہ آتا ہے'' اور یہ کہ ''اس طرح پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو ریاضی نہیں آتی تھی۔'' (نعوذ باللہ)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اپنی گفتگو کے دوران میں واضح کیا تھا، بات یہ ہے کہ یوں تو سینکڑوں لوگ ہیں جو قرآن میں غلطیاں تلاش کرنے کے دعوے کرتے ہیں لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام دعوے غلط اور جھوٹے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دعویٰ بھی ایسا نہیں جسے ثابت کیا جا سکے۔

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے، قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس حوالے سے بات کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات میں وراثت کا بیان موجود ہے۔

سورۂ بقرہ...... آیت ۱۸۰

سورۂ بقرہ...... آیت ۲۴۰

سورۂ نسا...... آیت ۱۹

لیکن جہاں تک ان حصوں کی پوری تفصیل کا تعلق ہے تو یہ سورۂ نساء کی آیات ۱۱، ۱۲ اور پھر ۱۷۶ میں بیان کی گئی ہے۔ ارون شوری نے جس بیان کا ذکر کیا ہے وہ سورۂ نساء کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں موجود ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْدَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْدَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْدَيْنٍ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْدَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ٥ ﴾ [النساء: ۱۱-۱۲]

''تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر (میت کی وارث) دو سے زاید لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ (یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے قرض جو اس پر ہو ادا کردیا جائے۔ اور تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کردیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے۔ جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی، اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے جب کہ وصیت

جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا بینا اور نرم خو ہے۔''

گویا مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں پہلے اولاد پھر والدین اور پھر دیگر حصے دار بیان کر دیے گئے ہیں۔ اسلام وراثت کے بارے میں بڑی تفصیلی اور مکمل رہنمائی دیتا ہے۔ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ مکمل تفاصیل کے لیے ہمیں حدیث کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے کہ جس کی تحقیق میں پوری زندگی صرف کی جا سکتی ہے۔ جب کہ ارون شوری صرف دو آیات پڑھ کر خود کو قانونِ وراثت پر رائے دینے کا اہل سمجھتا ہے۔

اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ریاضی کی ایک پیچیدہ مساوات حل کرنا چاہتا ہے لیکن علم ریاضی کے بنیادی اصول بھی نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر وہ اصول جسے BODMAS کہا جاتا ہے، یعنی:

BO: Brackets off

D: Division

M: Multiplication

A: Addition

S: Subtraction

یہ ترتیب BODMAS کا اصول کہلاتی ہے۔ اگر اس ترتیب کو نظر انداز کر دیا جائے، آپ پہلے تفریق کریں پھر ضرب دیں پھر جمع کر دیں تو یقیناً آپ کا جواب غلط ہوگا، اسی طرح کا معاملہ ارون شوری کا ہے۔

ایک سیدھا سا اصول ہے کہ آپ والدین اور میاں یا بیوی کا حصہ ادا کرنے کے بعد اولاد میں ترکہ تقسیم کریں گے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس طرح حصوں کا کل میزان ایک

سے زیادہ آ جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... میں ایک نومسلم ہوں۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، میں اپنے والدین کو یہ یقین کس طرح دلا سکتی ہوں کہ قرآن، انجیل کی نقل نہیں ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میری بہن نے ایک سوال پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ پہلے مسیحی تھیں اور پھر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ میں انھیں مبارک باد دینا چاہوں گا اور ایک بار نہیں بلکہ تین بار مبارک باد دینا چاہوں گا۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ میں دہریے کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس نے ''لا الہ'' تو کہہ دیا ہے۔ بہن کو میں تین دفعہ مبارک باد اس لیے دے رہا ہوں کہ اس نے ''لا الہ'' کہنے کے بعد ''الا اللہ'' بھی کہہ دیا ہے اور ''محمد رسول اللہ'' بھی کہہ دیا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ

''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبر ہیں۔''

لہٰذا میں اپنی بہن کو مبارک باد دیتا ہوں اور اب آتا ہوں ان کے سوال کی جانب۔

سوال یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کے سامنے یہ بات کس طرح ثابت کریں گی کہ قرآن بائبل کی نقل نہیں ہے۔ یا بائبل سے استفادہ نہیں کرتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ ایک تاریخی حقیقت ہی ایسی ہے جو اس قسم کی کسی بات کا امکان ہی ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرتِ محمد مصطفیٰ ﷺ اُمی تھے۔ یعنی پڑھے لکھے نہیں تھے۔

قرآن کہتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ؕ ﴾ [الاعراف : ۱۵۷]

''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمیؐ کی پیروی

اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔"

اور بائبل میں کہا گیا ہے:

"اور پھر وہ کتاب کسی ناخواندہ کو دیں اور کہیں اس کو پڑھ اور وہ کہے میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔" [یسعیاہ۔ باب ۲۹۔۱۲]

قرآن نے کہا کہ اس بات کا ذکر انجیل میں موجود ہے اور اگر آپ انجیل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ واقعی موجود ہے۔ وہ مستشرقین جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے انجیل سے استفادہ کیا تھا (نعوذ باللہ)، وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس وقت تک انجیل کا عربی زبان میں کوئی ترجمہ ہوا ہی نہیں تھا۔

عہد نامہ عتیق کا قدیم ترین عربی ترجمہ بھی پیغمبر اسلامؐ کے دو سو سال بعد کا ہے جب کہ عہد نامہ جدید کا عربی ترجمہ تو کہیں ۱۶۱۶ء میں جا کر ہوا تھا۔ یعنی ایک ہزار سال بعد۔ یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ دونوں کتابوں میں کہیں کہیں جزوی مماثلتیں موجود ہیں لیکن اس کا سبب استفادہ نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ دراصل ایک تیسرا ذریعہ ہے جو دونوں کتابوں کی اصل ہے۔

تمام الہامی کتابوں کا بنیادی پیغام یعنی توحید تو ایک ہی ہے۔ گویا تمام الہامی کتابوں کا پیغام مشترک ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ سابقہ کتب سماویہ ایک خاص عرصے کے لیے تھیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ وحی کی سابقہ صورتیں کسی خاص مدت یا خاص قوم کے لیے تھیں۔ لہٰذا وہ اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہ سکیں اور ان میں تحریف راہ پا گئی۔ اب ان کتب میں بہت سی انسانی تحریفات موجود ہیں۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود چوں کہ ان کی اصل ایک ہی تھی، لہٰذا مشترک نکات کا پایا جانا عین قرینِ قیاس ہے۔

محض ان مشابہتوں کی بنا پر یہ دعویٰ کر دینا بالکل غلط ہوگا کہ قرآنِ مجید میں انجیل یا دیگر صحائف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ حضرتِ محمد مصطفیٰ ﷺ نے بائبل سے نقل کر کے قرآن تحریر کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

اوراس طرح تو یہ کہنا بھی لازم آتا ہے کہ عہد نامہ جدید میں عہد نامہ عتیق کی نقل کی گئی ہے کیوں کہ ان دونوں میں بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں، لہٰذا حضرتِ عیسیٰ نے بھی پرانے عہد نامے سے استفادہ کیا ہوگا۔ (نعوذ باللہ) لیکن بات یہی ہے کہ ان دونوں صحائف کا بھی اصل ماخذ ایک ہی ہے۔

فرض کیجیے کوئی شخص نقل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی امتحان کے دوران میں کوئی شخص کسی سے نقل کرتا ہے، کیا وہ اپنے جواب میں کبھی اس شخص کا ذکر کرے گا جس سے نقل کی جارہی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے واضح طور پر حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ قرآن ان انبیا کا ذکر مکمل عزت و احترام کے ساتھ کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اگر قرآن نعوذ باللہ ان کی نقل ہوتی تو کبھی ان کا ذکر نہ کیا جاتا۔ لہٰذا اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن انجیل کی نقل نہیں ہے۔

محض تاریخی حقائق سے ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل ہو کہ قرآن اور انجیل میں سے کون سی کتاب درست ہے۔ لہٰذا ہم اپنے سائنسی علم سے مدد لیتے ہیں۔

سرسری جائزہ لینے پر قرآن اور بائبل کی بہت سی باتیں، قصص اور نکات یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو فرق آپ کے سامنے آجائے گا۔ مثال کے طور پر انجیل کی کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ دنیا چھ دن میں تخلیق کی گئی تھی، لیکن یہاں ''دن'' سے مراد ''۲۴ گھنٹے والا دن'' ہے۔ دوسری طرف قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے کہ کائنات چھ ایام میں تخلیق کی گئی تھی۔

﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ط ﴾

[الاعراف : ٥٤]

''درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں

پیدا کیا۔''

یہی بات سورۂ یونس کی تیسری آیت میں اور بعض دیگر مقامات پر بھی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ''ایام'' میں پیدا فرمایا۔ عربی لفظ ایام اصل میں ''یوم'' کی جمع ہے۔ یوم سے مراد ''دن'' بھی ہوتا ہے اور ایک طویل زمانہ بھی۔ لہٰذا جب ''چھ ایام'' سے مراد چھ طویل ادوار یا زمانے لیے جائیں تو جدید سائنس بھی اس بیان کو تسلیم کرتی ہے، لیکن جب بائبل یہ دعویٰ کرتی ہے کہ کائنات ۲۴ گھنٹے والے چھ دنوں میں بنی تھی تو کوئی بھی سائنسدان اس بیان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح بائبل کہتی ہے کہ دن اور رات پہلے دن بنادیے گئے تھے جب کہ سورج کی تخلیق چوتھے دن ہوئی تھی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ نتیجہ پہلے برآمد ہو اور سبب بعد میں تخلیق کیا جائے۔ روشنی کا ذریعہ ہی سورج ہے۔ بغیر سورج کے دن اور رات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بائبل کتاب پیدائش کی ابتدائی آیات میں یہی بتاتی ہے کہ روشنی، سورج کی تخلیق سے ۳ دن پہلے ہی تخلیق ہوگئی تھی۔ اور یہ قطعی غیر منطقی بات ہے۔

یہ بھی ایک غیر سائنسی اور غیر منطقی بیان ہے کہ دن اور رات تو پہلے تخلیق ہوجائیں اور زمین بعد میں وجود میں آئے۔ حالانکہ دن اور رات تو دراصل زمین ہی کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بائبل یہی کہتی ہے۔

دوسری طرف قرآن بھی روشنی اور سورج کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے لیکن قرآن یہ غیر سائنسی بلکہ غیر ممکن ترتیب پیش نہیں کرتا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ یہ خیال کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بائبل سے یہ باتیں لیں لیکن ان کی اصلاح کردی؟ ایسا نہیں ہوسکتا کیوں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کسی کے علم میں ہی نہیں تھیں۔

بائبل میں بتایا گیا ہے:

''خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہوگیا تھا اس کو سمندر اور خدا

نے دیکھا کہ اچھا ہے۔..........سو تیسرا دن ہوا۔

......سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے اور ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا......سو چوتھا دن ہوا۔" [پیدائش ۱: ۲۰۔۹]

لیکن آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چاند اور زمین دراصل ایک ہی بڑے ستارے کے حصے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ زمین سورج سے پہلے وجود میں آ جائے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل یہی بتا رہی ہے کہ زمین تیسرے دن تخلیق ہوئی جب کہ سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔

بائبل یہ بھی کہتی ہے کہ تمام نباتات تیسرے دن وجود میں آئیں:

"اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھل دار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی بیج رکھیں اُگائے اور ایسا ہی ہوا۔" [پیدائش ۱: ۱۲۔۱۱]

جب سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔ سورج کی روشنی کے بغیر نباتات کی افزائش ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک نیر اصغر ہے اور ایک نیر اکبر۔ ایک بڑی روشنی ہے ایک چھوٹی روشنی۔ یعنی بائبل چاند کو بھی ایک از خود روشن جسم قرار دیتی ہے۔

جب کہ قرآن کا بیان میں نے پہلے آپ کے سامنے پیش کیا۔ سورۂ فرقان کی آیت کے پیش نظر پتہ چلتا ہے کہ چاند کی روشنی مستعار ہے۔

تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارے پیغمبرؐ نے بائبل سے یہ باتیں نقل کیں۔ (نعوذ باللہ) لیکن بائبل کی تمام سائنسی غلطیاں درست کر دیں۔ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔

اگر آپ اُن قصص اور واقعات کا جائزہ لیں جو بائبل اور قرآن میں مشترک ہیں تو ان کے درمیان بھی آپ کو فرق نظر آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل ہمیں حضرت آدم علیہ السلام

کے بارے میں بتاتی ہے کہ زمین پر پہلے انسان حضرتِ آدم علیہ السلام تھے۔ لیکن بائبل ان کی زمین پر آمد کا وقت بھی معین کر دیتی ہے جو کہ تقریباً ۵۸۰۰ سال قبل بنتا ہے۔ جب کہ آج سائنس آثارِ قدیمہ کی مدد سے یہ ثابت کر چکی ہے کہ زمین پر انسان اس سے ہزار ہا سال پہلے بھی موجود تھا۔

اسی طرح بائبل حضرتِ نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی تفصیل سے بتاتی ہے۔ اور طوفان نوح کا بھی ذکر کرتی ہے۔ بائبل کا کہنا ہے کہ یہ طوفان عالم گیر تھا، یعنی پوری زمین پر آیا تھا۔ اور روئے زمین پر موجود تمام حیات اس طوفان کے نتیجے میں فنا ہو گئی تھی۔ سوائے ان کے جو حضرتِ نوح علیہ السلام کی کشتی میں موجود تھے۔ بائبل اس طوفان کا وقت اندازاً اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح کا بتاتی ہے۔ آج ماہرین آثار قدیمہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مصر کا گیارھواں حکمران خاندان اور بابل میں تیسرا حکمران خاندان اس وقت حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ان علاقوں میں اس طوفان کے کسی قسم کے اثرات کا سراغ نہیں ملتا۔

قرآن بھی طوفانِ نوحؑ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ایک تو قرآن اس طوفان کا وقت معین نہیں کرتا اور دوسرے قرآنی بیان کے مطابق یہ ایک مقامی طوفان تھا۔ قرآن اس طوفان کے عالم گیر ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ قرآن کے مطابق یہ سیلاب صرف قومِ نوحؑ کے لیے آیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا بیان ہے جس پر آج کے سائنسدان بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں آپ خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں بائبل سے استفادہ موجود ہے یا نہیں؟

سوال:...... پہلی بات تو میں یہ کرنا چاہوں گا کہ تمام ہندو گرو رجنیش کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ دوسرے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر قوم کی طرف ہدایت بھیجی گئی تھی۔ تو کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وید مقدس بھی الہامی کتابیں ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بھائی نے سوال پوچھنے سے پہلے ایک بات یہ کی کہ تمام ہندو گرور جنیش کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ میں نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تمام ہندو گرور جنیش کو بھگوان مانتے ہیں، میری تمام گفتگو ریکارڈ ہورہی ہے۔ آپ اسی گفتگو کی وڈیو ریکارڈنگ دیکھ سکتے ہیں لہٰذا یہاں تو یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ "بعض ہندو گرور جنیش کو بھگوان سمجھتے ہیں۔ میں نے تمام ہندوؤں کے بارے میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا تھا۔ میں ہندومت کے بارے میں، ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ان متون کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔

جہاں تک بھائی کے اس سوال کا تعلق ہے کہ چوں کہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیاء بھیجے ہیں اور متعدد صحائف نازل فرمائے ہیں تو کیا میں وید، شاستروں اور دیگر متون پر بھی یقین رکھتا ہوں؟ دیگر پیغمبروں پر بھی یقین رکھتا ہوں؟ ان کا بنیادی سوال یہی ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ قرآن ہمیں واقعی یہی بتاتا ہے۔

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ [فاطر: ٢٤]

"ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔"

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ [الرعد: ٧]

"اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔"

آپ کا سوال یہ ہے کہ کیا ان آیات کی روشنی میں، میں ویدوں پر یا ویدوں کے الہامی ہونے پر یقین رکھتا ہوں؟ کیا میں دیگر پیغمبروں پر یقین رکھتا ہوں؟ بات یہ ہے کہ قرآن ۲۵ انبیائے کرام کا ذکر نام لے کر کرتا ہے۔ حضرتِ آدم، حضرتِ ابراہیم، حضرتِ اسماعیل، حضرتِ موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد ﷺ سمیت ۲۵ انبیائے کرام کے اسمائے گرامی قرآن میں موجود ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے

کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں سے ۲۵ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ دیگر کے بارے میں امکان ہی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کسی شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید وہ نبی تھے، شاید نہیں تھے۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

تو کیا میں ویدوں کے الہامی ہونے پر یقین رکھتا ہوں؟ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ویدوں کی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات میں کوئی مطابقت پائی جاتی ہے؟ جی ہاں! ایسی مطابقت موجود ہے۔

مثال کے طور پر ویدوں میں خدا کا ذکر موجود ہے۔ یجر وید کے تیسرے باب کی آیت نمبر ۳۲ میں کہا گیا ہے:

''تم خدا کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے۔''

یجر وید، باب ۳۲، آیت ۳ میں تحریر ہے:

''خدا جسم اور شکل سے پاک ہے۔''

یجر وید کے باب نمبر ۴۰، آیت نمبر ۸ میں بھی یہی کہا گیا ہے:

''خدا نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت۔''

آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

''خدا ایک ہی ہے، دوسرا کوئی خدا نہیں ہے، ہرگز نہیں۔''

اسی طرح رگ وید، جلد ۸، باب ۱، آیت ۱ میں کہا گیا:

''تمام تعریفیں صرف اسی کے لیے ہیں۔''

رگ وید، جلد ۶، باب ۴۵، آیت ۱۶ میں کہا گیا:

''صرف ایک ہی خدا ہے، اسی کی عبادت کرو۔''

ہمیں ویدوں کے اس طرح کے بیانات قبول کرنے میں ہرگز تامل نہیں ہوگا۔ یہ بیانات الہامی بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے لیے صحیح اور غلط معلوم کرنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ معیار قرآنِ مجید ہے۔ کیوں کہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری اور حتمی ہدایت کا

ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو مذکورہ بالا بیانات کو تسلیم کرنے یعنی منجانب اللہ تسلیم کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن کچھ دوسری باتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ان کتابوں میں تحریف و تدلیس ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا ان کتابوں کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو کہ انسانی ہے، جو تحریف کے نتیجہ میں ان کا حصہ بنا ہے۔ اور اس حصے کو منزل من اللہ تسلیم کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ غیر سائنسی اور غیر منطقی بیانات جس طرح بائبل میں موجود ہیں اسی طرح ویدوں میں بھی موجود ہیں۔ اس وقت میں ان کے حوالے سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔

سو بات یہ ہے کہ ہمیں یہ امکان تسلیم کرنے پر تو کوئی اعتراض نہیں کہ اپنی اصل صورت میں یہ کتابیں الہامی ہوسکتی ہیں۔ انجیل کے بارے میں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اصل صورت میں یہ وحی خداوندی تھی۔ کیوں کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ وہ وحی ہے جو حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

اسی طرح پیغمبروں کا معاملہ ہے۔ یقیناً بہت سے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک رام اور کرشن وغیرہ جیسی شخصیات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ بھی نبی تھے؟ تو ہمارا جواب ہوگا کہ ''وہ نبی ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی'' یعنی ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مجھے ان لوگوں سے بالکل اتفاق نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ رام علیہ السلام یا کرشن علیہ السلام۔ یہ غلط ہے۔

میں یہی کہتا ہوں کہ ان کا نبی ہونا ممکن ضرور ہے لیکن فرض کیجیے کہ رام واقعی اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔ اور فرض کیجیے کہ وید واقعی الہامی کتابیں تھیں۔ پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص زمانے کے لیے تھے۔ اور اسی زمانے تک محدود تھے۔ ان کا پیغام صرف ایک خاص زمانے کے لوگوں کے لیے ہی تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کا آخری اور حتمی پیغام ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہے۔

انجیل اور وید وغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اپنی اصل صورت میں یہ منزل من اللہ تھے تو اپنے زمانے ہی کے لیے تھے۔ آج کے لیے نہیں۔ قرآن آخری وحی ہے اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں۔ لہٰذا آج ہمیں ہدایت کے لیے قرآن اور صاحب قرآنؐ ہی کی پیروی کرنا پڑے گی۔

سوال:...... میرا سوال یہ ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بالعموم ملاحدہ کی جانب سے پوچھا جاتا ہے۔ دہریے اور عقل پسند عموماً یہ سوال پوچھا کرتے ہیں۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ میرے ایک قریبی دوست کا بمبئی کے ایک عقلیت پرست گروپ کے ساتھ مباحثہ ہو گیا۔ اس نے انھیں وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں قائل کرنے کے لیے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کپڑا کہاں سے آیا ہے؟ کتاب کہاں سے آئی ہے؟ قلم کہاں سے آیا ہے؟ ہر چیز کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اس کا کوئی نہ کوئی خالق موجود ہے، اس نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ سورج کہاں سے آیا ہے؟ چاند کو کس نے بنایا ہے؟ اس نے ان سے کہا کہ آپ یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق موجود ہے۔ یہ کوئی ایک شخص بھی ہو سکتا ہے اور ایک کارخانہ بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اب میرے ان سوالوں کا جواب دو کہ سورج اور چاند کا خالق کون ہے؟

ان عقلیت پسندوں نے کچھ توقف کے بعد کہا کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق موجود ہے، لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ آپ اپنا بیان تبدیل نہیں کریں گے یعنی اس بیان پر قائم رہیں گے کہ ہر چیز کا کوئی خالق بھی ہوتا ہے۔ اپنے اس بیان سے پھریں گے نہیں۔

میرا وہ دوست بہت خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ سورج کو کس نے بنایا ہے؟ چاند کو کس نے بنایا ہے؟ مجھے میری ماں نے جنم دیا، انھیں اُن کی والدہ نے جنم دیا لیکن سوال یہ ہے کہ پہلا

خالق کون تھا؟

پہلا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہر چیز کو تخلیق کیا ہے۔ میرے دوست کا خیال تھا کہ وہ اس مباحثے میں غالب آ چکا ہے۔

لیکن پھر دہریے نے ایک سوال کیا۔ اس نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے ہیں لیکن شرط وہی ہے کہ آپ اپنی دلیل سے پھریں گے نہیں۔ اپنا بیان تبدیل نہیں کریں گے اور سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

میرے دوست کو شدید ذہنی دھچکا پہنچا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ساری رات سو نہیں سکا۔ اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور اس نے یہ پورا واقعہ مجھے سنایا۔ اس کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے وہی دلائل استعمال کر رہا تھا جو پہلے بھی بعض فلاسفہ استعمال کر چکے ہیں۔ اور یہ فلاسفہ منطق کا ایک اہم اصول نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی بات کا خود تجزیہ نہیں کرتے۔

اگر آپ میری گفتگو کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ میں نے کہیں بھی یہ دلیل استعمال نہیں کی کہ ہر چیز کا کوئی خالق ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر میں ایسا کہتا تو میں خود ہی پھنس جاتا۔ اسی لیے میں نے یہ دلیل پیش نہیں کی۔

میں نے تو خود دہریے سے یہ سوال کیا تھا کہ کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات کس کے پاس ہوں گی؟ اور اس کا جواب تھا کہ اس شے کے خالق کے پاس، موجد کے پاس، یہ جواب میں نے نہیں بلکہ ایک دہریے نے دیا تھا۔

فرض کیجیے یہ سوال مجھ سے کیا جاتا کہ:

"ذاکر بھائی، وہ پہلا شخص کون ہوگا جو کسی بھی نامعلوم مشین کے بارے میں ہمیں مکمل معلومات فراہم کر سکے؟"

میرا جواب یہ ہوگا کہ کوئی بھی شے جو بنائی گئی ہے، جو ایک ابتدا رکھتی ہے اس کے بارے میں، اس کے افعال کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والا پہلا شخص اس کا موجد

یا خالق ہی ہوگا۔ میں یہاں اپنی منطق استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ میں پھنسنا نہیں چاہتا۔

چناں چہ جب میں یہ جواب دیتا ہوں کہ ہر اس چیز کے بارے میں، جو ایک ابتدا رکھتی ہے، جو کسی وقت تخلیق ہوتی ہے، اس کے بارے میں علم رکھنے والی پہلی شخصیت اس کے خالق کی ہوگی تو اس دلیل کو استعمال کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔

سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ اس کائنات کی ایک ابتدا ہے۔ یہ کسی وقت عدم سے وجود میں آئی تھی۔ اسی طرح سورج کا بھی ایک آغاز ہے۔ چاند کا بھی ایک آغاز ہے۔ لہٰذا یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت وافعال کے بارے میں ہمیں علم کون فراہم کر سکتا ہے اور جواب ہوگا ''کائنات کا خالق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ۔''

آپ نے سوال پوچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی آپ سے یہ سوال کرے:

''میرے بھائی ٹام نے ایک بچے کو جنم دیا ہے، بتائیں یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور جانتا ہوں کہ ایک مرد بچے کو جنم نہیں دے سکتا لہٰذا بچے کی جنس کے بارے میں سوال لایعنی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ سوال پوچھنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے بنایا ہے۔ یہ سوال ہی لایعنی ہے۔ خدا ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ سے ہے۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال :...... بعض مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ دراصل نبی کریم ﷺ نے عربوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے قرآن تحریر کیا تھا اور اسے الہامی اس لیے قرار دیا تاکہ اس کی قبولیت میں اضافہ ہو سکے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میرے بھائی نے ایک سوال پیش کیا ہے اور ان کی

اس بات سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ بعض مستشرقین واقعی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے محبوب پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے غلط بیانی کی تھی۔ (نعوذ باللہ) اور یہ کہ قرآن کو کلامِ الٰہی قرار دینے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کی اصلاح کی جاسکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور قرآنِ مجید کا مقصد صرف عربوں کی اصلاح نہیں تھا بلکہ پوری انسانیت کی اصلاح تھا۔ ان کا پیغام محض عربوں ے لیے نہیں بلکہ پوری بنی نوع انسان کے لیے تھا۔

لیکن اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے تو اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کی اخلاقی طور پر اصلاح کرنا چاہتے تھے تو وہ اس کے لیے غیر اخلاقی ذرائع کیوں کر استعمال کرسکتے تھے۔ ایک اخلاقی معاشرے کی تشکیل غیر اخلاقی طریقوں سے کس طرح کی جاسکتی ہے۔

آپ خود تصور کیجیے۔ اگر آپ معاشرے کی اخلاقی اصلاح کرنا چاہتے ہوں تو کیا آپ اپنے کام کا آغاز دروغ گوئی سے کریں گے؟

دروغ گوئی اور غلط بیانی سے کام صرف وہی لوگ لیتے ہیں جو درحقیقت اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ جو غلط لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زبانی طور پر لاکھ کہتے رہیں کہ وہ دنیا کی اصلاح کرنا چاہتے لیکن درحقیقت وہ مال و دولت کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ میں پہلے ہی ثابت کرچکا ہوں کہ انھیں مال و دولت دنیا کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ سو اگر آپ کا مقصد سچائی ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع بھی سچائی پر مبنی ہی ہونے چاہئیں۔

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ [الانعام: ۹۳]

’’اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے دراں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی

نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا۔"

اگر نبی کریم ﷺ (نعوذ باللہ) غلط بیانی کر رہے ہوتے تو یقیناً وہ خود اپنی کتاب میں ایسا کرنے والے کو برا بھلا نہ کہتے۔ کوئی بھی ایسا نہ کرے گا کیوں کہ اگر آگے چل کر کوئی جھوٹ سامنے آجائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود کو ہی برا بھلا کہہ رہا تھا۔

اسی طرح آگے چل کر قرآنِ مجید میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ٥ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ٥ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ٥ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ٥ ﴾ [الحاقة: ٤٣-٤٧]

"یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔"

اگر نبی کریم ﷺ نے کبھی کوئی غلط بیانی کی ہوتی (نعوذ باللہ) تو وہ کبھی یہ باتیں اپنی کتاب میں درج نہ کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر یہ غلط بیانی لازماً پکڑی جاتی اور اس وقت ان آیات کا کیا مطلب ہوتا؟

اسی قسم کی بات قرآنِ مجید کی درجِ ذیل آیات میں بھی کی گئی ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ٥ ﴾ [الشوریٰ: ٢٤]

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مہر کر دے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے

فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔ وہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔''

﴿ اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾ [النحل : ۱۰۵]

''(جھوٹی باتیں نبیؐ نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔''

اسی طرح قرآنِ مجید میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں خود پیغمبر ﷺ کی بات کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ اگر قرآن (نعوذ باللہ) خود رسول اللہ ﷺ کی تصنیف ہوتی جیسا کہ بعض مستشرقین کہتے ہیں تو وہ خود ان باتوں کا ذکر کیوں کرتے؟

اس کی ایک واضح مثال سورۂ عبس میں ملتی ہے:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ ﴾ [عبس : ۱۰۔۱]

''ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالاں کہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔''

یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کچھ کفار کے سرداروں سے بات کر رہے تھے اور اس دوران ایک نابینا صحابی جن کا نام عبداللہ ابن مکتوم تھا، وہ اس گفتگو کے دوران الجھن پیدا کر رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کفار کے سرداروں سے اہم بات چیت فرما رہے تھے۔ نابینا صحابیؓ کو اس دوران میں بات ٹوکنی نہیں چاہیے تھی۔ لہٰذا نبی کریمؐ

نے انھیں سرزنش فرمائی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، کیسا ہی شخص ہوتا، یہ بات ایسی نہیں تھی جس پر اعتراض کیا جاسکتا۔ لیکن یہاں معاملہ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ آپؐ کا کردار اس قدر بلند تھا، اس قدر عظیم تھا، آپؐ غریب اور بے سہارا لوگوں کے اس قدر ہمدرد تھے کہ اس بات پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور آپؐ جب بھی اس صحابیؓ سے ملتے تو اس بات پر ان کا شکریہ ادا کرتے کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اصلاح فرمائی۔

اس قسم کی متعدد مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ تحریم، سورۂ نحل اور سورۂ انفال۔

اگر رسول اللہ ﷺ نے عربوں کی اصلاح کے لیے قرآن خود تحریر کیا ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مقامات قرآن میں موجود نہ ہوتے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں ایسے بہت سے سائنسی حقائق کا ذکر کیا جو کہ قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا قرآنِ مجید میں علم ریاضی سے متعلق بھی حقائق موجود ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بہن نے سوال کیا ہے کہ میں نے ایسے بہت سے سائنسی حقائق کے بارے میں بات کی ہے جن کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ تو کیا ایسے ریاضیاتی حقائق بھی ہیں؟ کیا قرآنِ مجید میں ریاضی کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے؟

جی ہاں، قرآن نے ایسی بہت سی باتیں ہمارے سامنے پیش کی ہیں جن کا تعلق ریاضی سے ہے۔ سب سے پہلے تو ہم ارسطو کے پیش کردہ اس اصول کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ ہر بیان یا تو درست ہوگا یا غلط۔ یعنی ہر بیان درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ صدیاں گزر گئیں اور ہر کوئی اس اصول کو درست تسلیم کرتا رہا۔ سو سال پہلے تک اس اصول کو بالکل درست سمجھا جاتا رہے۔ محض سو سال پہلے ہی ایک شخص نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر ہر بیان کے درست یا غلط ہونے کا امکان موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود یہ بیان بھی یا

درست ہوگا یا غلط۔ اگر یہ درست ہے تو ٹھیک، لیکن اگر یہ غلط ہے تو پھر؟ اس صورت میں ریاضی کا پورا نظام ہی منہدم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ریاضی دانوں نے ایک نیا موقف اپنایا۔ انھوں نے کہا کہ جب بھی آپ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دو ممکنہ معانی ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایک تو اصطلاحی معانی اور ایک لغوی معانی۔ بعض اوقات آپ اُس لفظ ہی کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اس کے معانی کے بارے میں نہیں۔ میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ایک بچہ جس کا نام اکبر ہے۔ میں اس کے بارے میں کہتا ہوں:

''اکبر چھوٹا ہے۔''

اب معانی کے لحاظ سے میں بالکل ٹھیک کر رہا ہوں۔ اکبر ایک چھوٹا لڑکا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اکبر چھوٹا ہے۔ لیکن ایک عربی جاننے والا شخص میری بات پر اعتراض کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکبر چھوٹا نہیں ہے۔ ''اکبر بڑا ہے۔'' اکبر کا مطلب ہی ''بڑا'' ہوتا ہے۔ اب ہوا یہ ہے کہ میں ایک لفظ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس لفظ کو استعمال نہیں کر رہا تھا۔

ایک اور مثال پر غور کیجیے۔ فرض کیجیے میں کہتا ہوں:

''۳ ہمیشہ ۴ سے پہلے آتا ہے۔''

کوئی میری اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا۔ ہر کوئی یہی کہے گا کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔ واقعی ۳ ہمیشہ ۴ سے پہلے آتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے ایک متشکک اس بات پر اعتراض کر دے۔ وہ مجھے بتائے گا کہ انگریزی لغت میں Three ہمیشہ Four کے بعد آئے گا۔ کیوں کہ حرف ''T'' ہمیشہ حرف ''F'' کے بعد ہی آتا ہے۔ یہاں معاملہ الٹ ہوگیا۔ میں بات استعمال کے لحاظ سے کر رہا ہوں لیکن وہ متشکک ایک ایسی مثال دے رہا ہے جہاں محض ذکر ہوا ہے۔ استعمال نہیں ہوا۔

یعنی جب آپ ایک لفظ سے کام لیتے ہیں تو اس کی دو ممکنہ صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو

آپ اس لفظ کا ذکر کر رہے ہوں گے اور یا اس لفظ کو استعمال کر رہے ہوں گے۔

اپنی گفتگو کے دوران میں نے سورۂ نساء کی یہ آیت آپ کے سامنے پیش کی تھی:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ○ ﴾ [النساء: ۸۲]

"کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔"

اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اور آج تک کوئی قرآن میں سے اختلاف کی کوئی مثال پیش بھی نہیں کر سکا۔ یعنی قرآن کلام خداوندی ہے۔ لیکن فرض کیجیے یہاں بھی ایک متشکک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں قرآن میں اختلاف دکھا سکتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کہاں؟ وہ کہتا ہے کہ "سورۂ نسآ، آیت ۸۲ میں "اختلاف" کا لفظ اس آیت میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کا بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے۔"

اب اختلاف کا لفظ تو واقعی قرآن میں موجود ہے تو کیا یہ واقعی ایک غلطی ہے؟ (نعوذ باللہ)۔ میں کہتا ہوں ٹھہرو، اس آیت کو غور سے پڑھو۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ "بہت سے اختلافات ہوتے" جب کہ تم صرف ایک جگہ اختلاف کا لفظ دکھا رہے ہو۔ یعنی قرآن کا بیان ہی درست ہے۔ کیوں کہ قرآن بہت سے اختلافات کے بارے میں کہہ رہا ہے اور اختلاف کا لفظ قرآن میں ایک ہی بار استعمال ہوا ہے، کثیر تعداد میں استعمال نہیں ہوا۔

لیکن اس طرح میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ کیوں کہ ایک اور متشکک اٹھے گا اور کہے گا کہ دیکھو قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ کسی اور کی جانب سے ہوتا تو تم اس میں "اختلافا کثیرا" پاتے۔ اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ "اختلافا کثیرا" کے الفاظ اس آیت میں موجود ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ)

مجھے اندازہ ہے کہ بات ذرا زیادہ پیچیدہ ہو گئی ہے۔ تفہیم ذرا مشکل ہو گئی ہے لیکن میں ایک آسان مثال بھی پیش کروں گا۔

بہر حال بات مذکورہ آیت کی ہو رہی تھی۔ اس آیت کریمہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ:

''اگر قرآن میں کثیر اختلاف ہوں تو یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔''

بلکہ فرمایا جا رہا ہے:

''اگر یہ غیر اللہ کی جانب سے ہوتا تو اس میں کثیر اختلاف ہوتے۔''

اور اسی لیے متشککین کی منطق درست نہیں۔ پہلی صورت میں ان کی منطق درست ہو سکتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے بات اس انداز میں بیان ہی نہیں فرمائی۔ اور مذکورہ بالا دونوں باتیں الگ ہیں۔ ایک ہی بات نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کریں۔

''بمبئی میں رہنے والے تمام لوگ ہندوستانی ہیں۔''

یہ ایک درست بیان ہے۔ لیکن اس بیان سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ:

''تمام ہندوستانی بمبئی میں رہتے ہیں۔''

تو یہ نتیجہ بالکل غلط ہوگا۔ کسی بیان کی معکوس صورت ہمیشہ درست نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ صورت بھی درست ہوتی ہے اور بعض اوقات نہیں بھی۔

اب میں ایک سادہ اور آسان سی مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ○ ﴾

[المومنون: ۲۔۱]

''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

یہ آیت پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ''ٹھہریں جناب! میں ایک ایسے مسلمان کو جانتا ہوں جو بڑے خشوع و خضوع سے پانچ وقت نماز پڑھتا ہے لیکن وہ دھوکہ باز ہے، لوگوں کو لوٹتا ہے۔ ہر معاشرے میں کالی بھیڑیں ہوتی ہیں لیکن دیکھیں یہاں قرآن کی بات غلط ثابت ہو رہی ہے۔ (نعوذ باللہ) کیوں کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ حقیقی مومن اپنی نمازوں میں

خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

میں اسے کہوں گا کہ ٹھہرو اور قرآن کے الفاظ غور سے پڑھو۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ حقیقی ایمان والے نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والا ہر شخص فلاح یافتہ مومن ہے۔ اگر قرآن نے یہ کہا ہوتا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والے تمام لوگ فلاح یافتہ مومن ہیں تو یہ بات غلط ثابت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ریاضی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے متشککین بھی ہیں جو قرآن میں غلطیاں ہی تلاش کریں گے، لہٰذا وہ منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے۔

میں ایک مثال اور پیش کرنا چاہوں گا، قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۚ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ [آل عمران : ۵۹]

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہوجا اور وہ ہوگیا۔''

آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ عیسیٰؑ اور آدمؑ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا، معانی بالکل صاف ہیں لیکن اگر آپ غور کریں تو ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ۲۵ مرتبہ آیا ہے اور حضرتِ آدم علیہ السلام کا ذکر بھی ۲۵ بار ہوا ہے، یعنی معانی کے لحاظ سے اگر دونوں یکساں ہیں تو دونوں کا ذکر بھی یکساں تعداد میں ہوا ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ ﴾ [الاعراف : ۱۷۶]

''اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو

زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو پھر بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔''

''آیات کو جھٹلانے'' کے الفاظ قرآنِ مجید میں پانچ مرتبہ آئے ہیں اور کتے کے لیے عربی لفظ کلب بھی پانچ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی مشبہ اور مشبہ بہ معنوی لحاظ سے تو یکساں ہیں ہی، ان کا ذکر بھی یکساں مرتبہ کیا گیا ہے۔

﴿ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴾ [فاطر: ۲۰]

''اور نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔''

عربوں میں اندھیرے کے لیے لفظ ''ظلمت'' استعمال ہوتا ہے جب کہ روشنی کے لیے نور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ظلمت کا لفظ قرآن مجید میں ۲۴ مرتبہ استعمال ہوا ہے جب کہ'' نور'' کا لفظ قرآن میں ۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ معنوی لحاظ سے دونوں یکساں نہیں ہیں بلکہ دونوں کا ذکر بھی یکساں تعداد میں نہیں ہوا ہے۔ دونوں برابر نہیں ہیں کیوں کہ ۲۳ اور ۲۴ برابر نہیں ہیں۔

گویا قرآن نے جنھیں یکساں قرار دیا ان کا ذکر بھی یکساں تعداد میں کیا اور جنھیں مختلف قرار دیا ان کا ذکر بھی مختلف ہے۔

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ لیکن آج ہم سب جانتے ہیں کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرسکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :......بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ بہن نے سوال پوچھنے سے پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نومسلمہ ہیں۔ میں پہلے تو انھیں بھی تین بار مبارک باد

پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کے بعض مقامات پر فرماتا ہے کہ بعض لوگوں کے ''دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے'' اور یوں ان لوگوں کی اصلاح کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی قرآنِ مجید میں ایسے ارشادات موجود ہیں۔

ان کا سوال یہ ہے کہ آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے تو پھر قرآن یہاں دل کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ سوچنے کا کام دل کرتا ہے۔ تو کیا یہاں (نعوذ باللہ) قرآن کا بیان غلط ہے؟

قرآنِ مجید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ ﴾ [طٰهٰ: ۲۸-۲۵]

''موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔''

یہاں بھی یہی دعا کی جا رہی ہے کہ میرا سینہ یعنی دل کھول دے۔ بات یہ ہے کہ عربی لفظ سے ایک مراد تو سینہ یا دل ہوتا ہے اور دوسرے ''مرکز''۔ لفظ صدر کا ایک مطلب مرکز بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کراچی جانے کا اتفاق ہو تو وہاں ایک علاقہ ہے کراچی صدر۔ صدر کراچی سے مراد ہوتی ہے کراچی کا مرکز۔ یعنی لفظ صدر سے مراد مرکز ہے۔ سو قرآن بھی یہاں یہی بتا رہا ہے کہ سوچنے سمجھنے کے مرکز پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور اس مرکز سے مراد دماغ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ میرے فہم و ادراک کے مرکز کو کھول دے۔ (آمین)

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... ذاکر صاحب کیا یہ تضاد نہیں ہے کہ قرآن بعض مقامات پر ابلیس کو جن

قرار دیتا ہے اور بعض جگہ فرشتہ؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ متعدد مقامات پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیا ہے اور پھر ایک مقام پر قرآن اسے جن قرار دیتا ہے تو کیا یہ تضاد نہیں ہے؟

بات یہ ہے کہ قرآن متعدد مقامات پر ابلیس و آدمؑ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ یہ واقعہ قرآنِ مجید میں کئی سورتوں میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ اسراء، سورۂ طٰہٰ، سورۂ صٓ، وغیرہ۔ ان تمام سورتوں میں یہی بات کی گئی ہے کہ جب فرشتوں کو حکم ملا کہ آدمؑ کے سامنے جھک جائیں تو سب سجدے میں جھک گئے سوائے ابلیس کے، جس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ مذکورہ بالا تمام سورتوں میں یہی بات کی گئی ہے لیکن ایک مقام پر ابلیس کو جن قرار دیا گیا ہے۔ جس کے حوالے سے بھائی نے سوال کیا ہے۔ انھوں نے حوالہ نہیں دیا لیکن یہ سورۂ کہف کی یہ آیت ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ﴾ [الکھف : ٥٠]

"یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔"

اس آیت میں ابلیس کو جن قرار دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوا کہ سات مقامات پر ابلیس کا ذکر فرشتوں کے ضمن میں ہو رہا ہے اور پھر ایک مقام پر اسے جن قرار دیا جا رہا ہے تو کیا یہ تضاد اور اختلاف نہیں ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم انگریزی تراجم پڑھتے ہیں اور ان کی مدد سے قرآن کو سمجھتے ہیں لیکن قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اور عربی زبان کا ایک قاعدہ ہے جسے "تغلیب" کہتے ہیں۔ تغلیب سے مراد ہوتی ہے کہ جب آپ اکثریت کا ذکر کرتے ہیں تو اقلیت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ یعنی جب آپ لوگوں کی اکثریت سے خطاب کریں گے تو اقلیت کو شامل

سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے ایک جماعت میں سو طالب علم ہیں۔ جن میں سے ننانوے لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ اب اگر میں عربی میں انھیں کہوں:

''لڑکو، کھڑے ہو جاؤ۔''

تو وہ لڑکی بھی کھڑی ہو جائے گی کیوں کہ وہ تغلیب کے اصول کو سمجھتی ہوگی۔ لیکن اگر میں انگریزی میں کہوں کہ؛

" All boys, Stand up."

تو صرف لڑکے کھڑے ہوں گے، لڑکی بیٹھی رہے گی۔ کیوں کہ انگریزی زبان میں تغلیب کا اصول موجود نہیں ہے۔

لہٰذا بات یہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اور عربی زبان میں جب فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکثریت فرشتوں کی تھی۔ ابلیس جن تھا یا فرشتہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ حکم سب کے لیے تھا۔

ان تمام آیات میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی کہ وہ جن تھا یا فرشتہ؟ کیوں کہ تغلیب کے قاعدے کی رو سے حکم سب کو ملا تھا۔ اور سب کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ لیکن سورۂ کہف کی بیسویں آیت میں بتا دیا گیا کہ وہ ایک جن تھا۔

دوسری بات یہ کہ فرشتے اپنی مرضی کے مالک نہیں ہوتے۔ انھیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ہر حکم پر بلا چون و چرا عمل پیرا ہونا ہوتا ہے۔

جب کہ جن ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ لہٰذا اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک جن ہی تھا۔ مجھے اُمید ہے، آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں خدا مافوق الفطرت ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو پھر وہ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کر سکتا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے سوال پوچھا ہے کہ خدا مافوق الطفرت ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں نہیں اختیار

کرسکتا؟ وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ خدا مافوق الفطرت ہے۔ عموماً جتنے بھی لوگ خدا کو مانتے ہیں سب ہی یہ بات کرتے ہیں کہ خدا مافوق الفطرت ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا واقعی خدا مافوق الفطرت ہے۔ خدا کو مافوق الفطرت Super Natural کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ خدا ایک چیز ہے اور فطرت ایک دوسری چیز جس پر خدا فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ قرآن کے بیان کردہ تصور خدا کے مطابق خدا کو مافوق الفطرت نہیں کہنا چاہیے۔ کیوں کہ فطرت تو خدا کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے جس نے فطرت کو خلق فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ فطرت کچھ کہے اور خدا کچھ اور کہے۔

آپ کی فطرت یعنی فطرتِ انسانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں سے ایک ''فاطر'' بھی ہے۔ یہ قرآنِ مجید کی پینتیسویں سورۃ کا نام بھی ہے۔ فاطر کا لفظ فطرت ہی سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے تخلیق کرنے والا، بنانے والا، فطرت عطا کرنے والا، مخلوقات کی اصل فطرت وضع کرنے والا۔

اسی طرح رمضان المبارک میں ہم مغرب کے وقت روزہ افطار کرتے ہیں یعنی روزہ توڑتے ہیں۔ افطار کا مطلب ہے روزہ توڑنا۔ فاطر کا مطلب ہے خالق۔ اشیا کو بنانے والا، صورت عطا کرنے والا، فطرت عطا کرنے والا۔

قرآن لوگوں سے کہتا ہے کہ مظاہر فطرت پر غور کرو، سورج اور چاند کی گردش پر غور کرو یہ سب قوانین فطرت کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے مدار سے باہر نہیں جاتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تصور بھی عین فطری ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۝ ﴾ [الاحزاب: ٦٢]

''اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

اسی طرح کا پیغام قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر بھی دیا گیا ہے۔ سورۂ روم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ﴾

[الروم: ۳۰]

''قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں کی جا سکتی۔''

آج کوانٹم فزکس اور جدید ترین سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کسی دیکھنے والے کے بغیر کسی شے کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ کائنات بھی لایعنی ہے اگر اس پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایک نام الشہید بھی ہے یعنی گواہ۔ یعنی خدا مافوق الفطرت نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے، کہ خدا اگر سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو وہ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کر سکتا؟

اس بات کو سمجھانے کے لیے میں خدا پر ایمان رکھنے والوں سے ایک سوال کیا کرتا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ کا تصور ان کے لیے واضح تر ہو سکے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہر شے کو پیدا کر سکتا ہے؟

اور ان کا جواب ہوتا ہے کہ ہاں اللہ تعالیٰ ہر چیز پیدا فرما سکتا ہے۔

پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کرنے پر قادر ہے؟

ان کا جواب ہوتا ہے:

ہاں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔

میرا تیسرا سوال ہوتا ہے:

کیا اللہ تعالیٰ کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جسے وہ فنا نہ کر سکے؟

اور یہاں وہ پھنس جاتے ہیں۔ اگر وہ جواب ہاں میں دیتے ہیں کہ خدا کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جسے وہ فنا نہ کر سکے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے دوسرے بیان کی نفی کر رہے ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ جواب نفی میں دیتے ہیں، اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی شے نہیں بنا سکتا جسے وہ فنا نہ کر سکے تو وہ اپنے پہلے بیان کی تردید کرتے

ہیں یعنی یہ کہ اللہ ہر چیز بنا سکتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ منطقی انداز میں نہیں سوچ رہے ہوتے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ایک طویل القامت پست قد آدمی نہیں بنا سکتا۔ آدمی یا تو طویل قامت ہوگا یا پست قد اللہ تعالیٰ پست قامت کو طویل کرسکتا ہے لیکن پھر وہ پست قد نہیں رہے گا۔ وہ طویل قامت کو پست قد کرسکتا ہے لیکن پھر وہ طویل نہیں رہے گا یا وہ اس کا قد درمیانہ کرسکتا ہے جو پست ہوگا نہ طویل لیکن وہ ایک انسان کو طویل القامت بونا نہیں بنا سکتا۔

میں ایسے ہزار ہا کاموں کی فہرست بنا سکتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ نا انصافی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ یہ تمام کام نہیں کرسکتا کیوں کہ خدا ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ یہ سب کام نہیں کرسکتا۔ وہ بھول نہیں سکتا، وہ ظلم نہیں کرسکتا۔

پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے مار سکتا ہے، فنا کرسکتا ہے، ختم کرسکتا ہے لیکن کسی ایسی جگہ نہیں بھیج سکتا جہاں اس کا حکم نہ چلتا ہو۔ وہ مجھے فنا کرسکتا ہے لیکن اپنی خدائی سے باہر نہیں نکال سکتا۔ کیوں کہ سب کچھ اسی کا ہے سب کچھ اس کی خدائی میں ہے۔

قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔''

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔ یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، سورۂ بقرہ میں، سورۂ آل عمران میں، سورۂ فاطر میں اور متعدد دیگر آیات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ٥ ﴾

کہیں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ اللہ ہر کام کرسکتا ہے اور ان دونوں باتوں میں کہ

''اللہ ہر کام کرسکتا ہے'' اور

''اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''

زمین وآسمان کا فرق ہے۔

بلکہ قرآنِ مجید میں تو ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ [البروج: ١٦]

''وہ جو کچھ چاہے کرڈالنے والا ہے۔''

یعنی وہ جو کچھ چاہتا ہے، جس بات کا ارادہ کرتا ہے، وہی کرتا ہے۔ وہ ارادہ کس کام کا کرتا ہے اللہ، صرف افعال الٰہیہ ہی کا ارادہ فرماتا ہے۔ خدائی کام ہی کرتا ہے۔ ایسے کام نہیں کرتا جو اس کے مرتبہ سے فروتر ہوں۔

جہاں تک آپ کے بنیادی سوال کا تعلق ہے، تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کرسکتا؟

خدا کے انسانی صورت اختیار کرنے کا فلسفہ ''حلول'' کہلاتا ہے اور اس فلسفے کے ماننے والوں نے اپنی ایک بظاہر خوبصورت منطق وضع کر رکھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے، ان کے دکھ درد اور مسائل کو سمجھنے کے لیے انسانی صورت اختیار کرتا ہے تاکہ وہ جان سکے کہ جب آپ دکھی ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں، جب آپ خوش ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ اور اس طرح وہ انسانیت کے لیے اوامر ونواہی وضع فرماتا ہے۔ یہ عقیدۂ حلول ہے۔

لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ منطق بالکل کمزور ہے۔ فرض کیجیے میں کسی شے کا خالق ہوں۔ فرض کیجیے میں ایک ٹیپ ریکارڈر یا ٹیلی ویژن ایجاد کرتا ہوں۔ اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس ٹیپ ریکارڈر یا ٹی وی کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا، مجھے خود ٹیپ ریکارڈر یا ٹی وی بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے صرف یہ کرنا ہوگا کہ ایک ہدایتی کتابچہ لکھ دوں کہ اس ٹیپ ریکارڈر کو استعمال کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ اس میں کیسٹ کس طرح ڈالی جائے گی اور کون سا بٹن دبانے

سے یہ چل پڑے گا؟ کون سا بٹن دبانے سے رک جائے گا۔ یہ بٹن دبائیں تو فارورڈ ہوگا، فلاں بٹن دبائیں تو ریوائنڈ ہوگا۔

اسی طرح انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کو خود انسان بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسانوں کو ان کا بھلا برا بتانے کے لیے وہ صرف یہ کرتا ہے کہ انھی میں سے ایک شخص کو منتخب کرتا ہے اور اس کے ذریعے انھیں ہدایتی کتابچہ فراہم کر دیتا ہے۔

یہ کتابچہ کیا ہے؟ قرآنِ مجید ہی وہ ہدایت نامہ ہے جس کے ذریعے انسانیت کو اوامر و نواہی کا علم دیا گیا ہے۔ انھیں بتا دیا گیا ہے کہ ان کے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ قرآن کے ذریعے انھیں مکمل ہدایت فراہم کر دی گئی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو انسانی صورت اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آپ پوچھتے ہیں:

''کیا خدا انسانی صورت اختیار کرسکتا ہے؟''

میں کہتا ہوں، ہاں، کرسکتا ہے لیکن جس وقت وہ انسانی صورت میں آئے گا وہ خدا نہیں رہے گا۔ کیوں کہ انسان فانی ہے اور خدا لافانی۔ کوئی بیک وقت فانی اور لافانی کس طرح ہوسکتا ہے؟

اسی طرح انسانوں کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انھیں کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ [الانعام: ١٤]

''کہو، اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا مالک ہے جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے۔''

روزی اور خوراک کی ضرورت تمام انسانوں کو ہوتی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح انسان کو نیند کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾

[البقرہ: ۲۵۵]

اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔''

انسان کو سونے کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور آرام کی بھی۔ اسے کھانے کی بھی حاجت ہوتی ہے اور پینے کی بھی۔ جس وقت آپ خدا کے انسانی صورت میں آنے کی یا مافوق الفطرت ہونے کی بات کرتے ہیں تو گویا آپ ملحد اور دہریے کے ہاتھ میں وہ چھڑی دے دیتے ہیں جس سے وہ آپ کو پیٹ سکتا ہے۔

لہٰذا خدا مافوق الفطرت نہیں، عین فطری ہے اور وہ انسانی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔

اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... میں ایک عیسائی ہوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اسلام حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ انھیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح مسلمان یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اگر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں ہیں تو پھر بھی وہ حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ضرور ہیں۔ تو آپ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کیوں پیش نہیں کرتے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوال عموماً مشنریوں کی جانب سے، مسیحی مبلغین کی جانب سے پوچھے جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بھائی ایک مبلغ ہیں یا نہیں لیکن اس قسم کے سوالات عموماً وہی کرتے ہیں۔ انھوں نے دو تین مثالیں دیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا یا یہ کہ ان کی پیدائش ایک معجزے کے طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی۔ جب کہ

حضرتِ محمد مصطفےٰ ﷺ کو آسمان پر بھی نہیں اٹھایا گیا۔ان کے والد بھی تھے اور والدہ بھی۔

اس قسم کے سوالات کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ افضل کون ہے؟ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام ۔اسی طرح پوچھا جاتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نام لے کر قرآنِ مجید میں ۲۵ مرتبہ کیا گیا ہے۔ جب کہ حضرتِ محمد ﷺ کا صرف پانچ مرتبہ۔تو افضل کون ہے؟ اور ہمارے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اس طرح تو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام ہی افضل ہیں۔

تو بھائی! آپ چاہتے ہیں کہ میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بات کروں۔تو بات یہ ہے کہ اسلام وہ واحد غیر عیسائی مذہب ہے، جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایمان کی شرط ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کیا جائے۔ہم ان کی بغیر باپ کے پیدائش پر بھی یقین رکھتے ہیں حالاں کہ دورِ حاضر کے بہت سے عیسائی بھی اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔

ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، اللہ کے حکم سے اندھوں کو بینا کر دیا کرتے تھے۔

لیکن یہاں ہماری راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ ہم حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہرگز نہیں سمجھتے۔اور نہ ہی ہم انھیں خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ہم انھیں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مانتے ہیں۔

اب ہم آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں کہ اگر قرآن یہ بتاتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا جب کہ حضرتِ محمد ﷺ کو آسمان پر نہیں اٹھایا گیا تو پھر دونوں میں سے افضل کون ہے؟............

قرآن میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

﴿ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا۟ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥ ط ﴾

[النسآء: ۱۷۱]

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی

بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا۔''

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب کو غلو سے منع کیا گیا ہے۔ کون سے غلو سے؟ ایک طرف یہود تھے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت ہی کا انکار کر رہے تھے اور انھیں جھوٹا کہہ رہے تھے۔ جب کہ عیسائی انھیں خدا قرار دے رہے تھے۔ دونوں طرف انتہا پسندی تھی۔

خدا صرف ایک ہی ہے۔ رفع مسیح کا سبب غلط فہمی رفع کرنا تھا۔ ان کی آمد ثانی بطورِ رسول کے نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں نئی تعلیمات دینے کے لیے نہیں آئیں گے۔

سورۂ مائدہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدہ: ۳]

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ لیکن وہ کوئی نئی تعلیم نئی شریعت دینے کے نہیں آئیں گے۔ بلکہ وہ خود فرمائیں گے:

''یا باری تعالیٰ، تو گواہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کو کبھی اپنی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا۔ میں نے انھیں کبھی نہیں کہا کہ مجھے خدا کا بیٹا سمجھیں۔''

درحقیقت وہ عیسائیوں ہی کے لیے تشریف لائیں گے مسلمانوں کے لیے نہیں۔

دوسری بات آپ کرتے ہیں ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کے حوالے سے۔ اگر آپ اس وجہ سے انھیں خدا قرار دیتے ہیں کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو اس بات کا جواب قرآن اِن الفاظ میں دیتا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ

كُنْ فَيَكُوْنُ ○ ﴾ [آل عمران : ٥٩]

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔''

کیا حضرتِ آدم علیہ السلام کا کوئی باپ تھا؟

نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی ماں بھی نہیں تھی۔ اگر اس بنیاد پر آپ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دیتے ہیں تو پھر حضرتِ آدم علیہ السلام کو ان سے بڑا خدا قرار دینا چاہیے۔ (نعوذ باللہ)

انجیل تو ایک اور غیرِ معمولی انسان King Malchisedec کا بھی ذکر کرتی ہے، جس کا نہ کوئی آغاز تھا اور نہ اختتام۔

جہاں تک سوال ہے قرآنِ مجید میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر پچیس مرتبہ ہونے کا اور حضرتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر صرف پانچ مرتبہ ہونے کا تو اس کی وجوہات بھی بالکل واضح ہیں۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پر (یہودیوں کی طرف سے) الزامات تھے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی الزام نہیں تھا جس کا جواب دیا جانا ضروری ہوتا۔ جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود وہاں موجود تھے۔ جو شخص آپ کے سامنے موجود ہو اس کو بار بار مخاطب کرنے یا اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو دوست موجود نہ ہو اس کا ذکر آپ ہر بار نام لے کر کریں گے۔

لہٰذا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام چوں کہ اس وقت موجود نہیں تھے، جب قرآن نازل ہو رہا تھا، لہٰذا ان کا ذکر ہر بار نام لے کر کیا گیا۔ اور اگر یہی معیار ہے تو پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو ۱۳۲ مرتبہ کیا گیا ہے تو کیا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے افضل ہیں؟ نہیں۔ بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ چوں کہ وہ موجود نہیں تھے، لہٰذا ان کا ذکر ہر بار نام لے کر کیا جانا ضروری تھا۔

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:......میرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ حالاں کہ آج ایسے جدید طریقہ ہائے کار دریافت ہو چکے ہیں جن کی مدد سے بآسانی بچے کی جنس معلوم ہو سکتی ہے۔ اس صورتِ حال کی آپ کیا وضاحت فرمائیں گے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:......بہن نے سوال پوچھا ہے کہ قرآن کے مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ رحم میں پلنے والے بچے کی جنس کیا ہے؟ میں ان کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج ایسے کئی جدید ٹیسٹ دریافت ہو چکے ہیں جن کی مدد سے بچے کی جنس معلوم کی جا سکتی ہے۔ تو کیا یہ ایک غلطی ہے؟

بہن قرآنِ مجید کی جس آیت کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ سورۂ لقمان کی ایک آیت ہے۔ اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ [لقمٰن: ٣٤]

”اُس گھڑی کا (قیامت) علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے ان پانچ باتوں کا علم سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔ جہاں تک بچے کی جنس کے حوالے سے آپ کے سوال کا تعلق ہے تو بات یہ ہے یہ محض غلط فہمی ہے جس کی وجہ تراجم خصوصاً بعض اُردو تراجم ہیں۔ جن میں اس آیت کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی بچے کی جنس کے بارے میں نہیں جانتا۔ آیت میں جنس کا ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم

میں کیا ہے؟ قرآن بچے کی جنس کے حوالے سے بات نہیں کر رہا بلکہ اس بچے کے کردار اور شخصیت کے حوالے سے بات کر رہا ہے۔ کیا وہ بچہ نیک ہوگا، ایمان دار ہوگا یا بے ایمان؟ وہ معاشرے کے لیے کیا کردار ادا کرے گا؟ وہ انجینئر بنے گا؟ ڈاکٹر بنے گا؟ اور یقین کیجیے اپنے تمام تر علم طب اور سائنسی معلومات کے باوصف یہ باتیں آج بھی وقت سے پہلے کوئی نہیں بتا سکتا۔ لہٰذا یہ محض غلط تراجم سے پیدا ہونے والی غلط فہمی ہے۔ آپ لغات دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی لغات بھی ہیں جو غیر مسلموں کی مرتبہ ہیں۔ ان میں سے Lane Lexicon سب سے زیادہ مشہور ہے۔ آپ ان کی مدد سے خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیاتِ مبارکہ میں جنس کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔

اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ بھی سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کسی کے علم میں نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے قیامت آنے کی پیش گوئیاں کیں۔ مثال کے طور پر نومبر ۱۹۹۲ء میں ٹائمز آف انڈیا اخبار میں یہ خبر آئی کہ کوریا کے کسی چرچ نے یہ اعلان کیا کہ دنیا نومبر ۱۹۹۲ء میں ہی ختم ہو جائے گی۔

اس چرچ سے وابستہ تمام لوگ مذکورہ تاریخ کو اس چرچ میں جمع ہوئے لیکن ہوا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ دنیا آج بھی قائم ہے اور قیامت کی پیش گوئی کرنے والے لوگوں کے پیسے لے کر فرار ہو گئے۔

اسی طرح بارش کا معاملہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج محکمہ موسمیات وقت سے پہلے ہی بارش کی پیش گوئی کر سکتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ پیش گوئیاں کس حد تک درست ہوتی ہیں خصوصاً انڈیا میں۔

لیکن ہو سکتا ہے بعض لوگ کہیں کہ ترقی یافتہ ممالک مثلاً امریکہ میں یہ پیش گوئیاں درست ہوتی ہیں۔ چلیے ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔ فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں واقعی اطلاعات درست ہوتی ہیں لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ محکمہ موسمیات بارش کی پیش گوئی کس طرح کرتا ہے؟ اس کے لیے بادلوں کی موجودگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر ہوا کا رخ دیکھا

جاتا ہے۔ اور یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں بارش تو بادلوں میں موجود ہوتی ہے۔ صرف برسنے کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی طالب علم امتحان دے، جس کا نتیجہ ایک ماہ بعد آنا ہو۔ تین ہفتے بعد وہ استاد جس نے پرچے چیک کیے ہیں وہ پیش گوئی کرے کہ فلاں طالب علم اوّل آئے گا۔ اس میں کوئی خوبی نہیں کیوں کہ پرچے چیک کرنے کی وجہ سے اسے وہ معلومات پہلے ہی حاصل ہوگئی ہیں جو دوسرے لوگوں کو ایک ہفتے بعد حاصل ہوں گی۔

بات تو جب ہے کہ محکمۂ موسمیات کسی خاص علاقے کے بارے میں بغیر بادلوں کو دیکھے یہ بتائے کہ ۲۰۰ سال بعد وہاں بارش ہوگی یا نہیں؟ میں چیلنج کرتا ہوں کوئی بھی محکمہ موسمیات دوسو سال کی پیش گوئی کرے کہ دنیا میں کہاں کتنی بارش ہوگی اور وہ کبھی ایسا نہیں کرسکیں گے۔

اس کے بعد موت کا معاملہ آتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک خودکشی کرنے والا یہ بتاسکتا ہے کہ وہ کہاں اور کس وقت مرے گا لیکن ہم جانتے ہیں کہ خودکشی کی کوشش کرنے والوں کی اکثریت ناکام ہوجاتی ہے۔ دنیا میں کتنے فی صد لوگ خودکشی کی کوشش کرتے ہیں؟ ایک انتہائی معمولی اور ناقابل ذکر تعداد۔ اوران کی اکثریت بھی اپنی کوشش میں ناکام ہوجاتی ہے۔ کچھ لوگ زہر کھاتے ہیں اور پھر کسی کو بتادیتے ہیں۔ انھیں ہسپتال پہنچایا جاتا ہے اوران کی جان بچالی جاتی ہے۔

اگر آپ کہیں سے چھلانگ مارتے ہیں تو پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ آپ مرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔ اگر اللہ آپ کو بچانا چاہے تو پھر بھی بچاسکتا ہے۔ اور اگر آپ مرجاتے ہیں تو پھر بھی آپ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کی مرضی سے ہی مرتے ہیں۔

اور جہاں تک آخری بات کا تعلق ہے کہ کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کیا کمائے گا تو اس کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ بھائی ذاکر مجھے تو پتہ ہے کہ میں دو ہزار روپے کماؤں گا۔ میری ماہانہ آمدن دو ہزار روپے ہے۔ تو کیا قرآن کا بیان غلط ہے؟

نہیں، کیوں کہ قرآن آپ کی معاشی آمدن کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ دنیاوی کمائی کا ذکر نہیں کر رہا۔ یہاں لفظ ''تکسب'' استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد اچھے برے اعمال بھی ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک نیک اعمال کا تعلق ہے وہ اگر آپ کرتے بھی ہیں تو آپ کو یہ علم تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کتنا ثواب کما رہے ہیں؟

اسی طرح اگر آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو پھر بھی آپ یہ نہیں جانتے کہ اس کی آپ کو کتنی سزا ملے گی۔ ان تمام باتوں کا حساب اللہ ہی کے پاس ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... ارون شوری نے اسلام کے خلاف متعدد مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ آپ انھیں چیلنج یعنی عوامی مناظرے کا چیلنج کیوں نہیں دیتے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... سوال پوچھا گیا ہے کہ میں ارون شوری کو مناظرے کا چیلنج کیوں نہیں دیتا، جس نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ تحریر پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بیش تر مقالات کا تعلق دو نکات سے ہوتا ہے۔ ایک تو وہ خواتین کے حوالے سے بات کرتا ہے کہ اسلام خواتین کو مساوی حقوق نہیں دیتا اور دوسرے وہ یہ کہتا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد مذہب ہے۔ یہ ایک بے رحم اور ظالم مذہب ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ ادھر ادھر کی باتیں جیسا کہ ایک بھائی نے سوال پوچھا تھا کہ کیا (نعوذ باللہ) خدا ریاضی نہیں جانتا؟ ہم ان باتوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور یقین کیجیے اس کی تمام باتیں سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے، غلط حوالوں اور غلط ترجموں کو بنیاد بنا کر کے کی گئی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کی وضاحت کر سکتا ہوں اور کر رہا ہوں۔

اگر آپ اس کی تازہ ترین کتاب (World of Fatwas, Shariah in Action.) کا جائزہ لیں جو کچھ ہی دن پہلے بمبئی سے شایع ہوئی ہے۔ اس کے سرورق پر قرآنِ مجید کی آیت درج کی گئی ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ

بَیْنَھُمْ ﴾ [الفتح : ۲۹]

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔''

یہاں بھی اس نے وہی کام کیا ہے کہ سیاق وسباق سے الگ کر کے ایک بات پیش کر دی ہے اور تاثر یہ پیش کرنا چاہا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے حق میں بے رحم ہیں۔ اگر آپ اس آیت کو درست سیاق وسباق میں پڑھنا چاہیں تو یہ بات آیت نمبر ۲۵ سے شروع ہو رہی ہے۔ اور فرمایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ، کفار جنھوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور قربانی کرنے سے روکا، ان کے حق میں مسلمان سخت ہیں۔ یہاں ذکر ان کفار کا ہو رہا ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو حج کا فریضہ ادا کرنے سے روکا تھا، آپ خود بتائیے کہ اگر آج کوئی عیسائیوں کو ویٹیکن سٹی میں داخل ہونے سے روکے تو عیسائی اسے اچھا سمجھیں گے یا برا؟

یا فرض کیجیے کوئی ایک ہندو کو بنارس میں داخل ہونے سے روک دے تو کیا وہ ہندو اس روکنے والے کو پسند کرے گا؟

قدرتی بات ہے کہ وہ اسے ناپسند کرے گا۔ یہاں بھی اگر آپ سیاق وسباق کو ملحوظ رکھ کر مطالعہ کریں تو یہی بات کی جا رہی ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے اور حج کا فریضہ ادا کرنے سے روکا ہے مسلمانوں کو ان کے حق میں سخت اور آپس میں نرم خو ہونا چاہیے۔

اس کتاب کے صفحہ ۵۷۱ اور ۵۷۲ پر وہ اپنی پسندیدہ آیت کا حوالہ دیتا ہے۔ یہ سورۂ توبہ کی پانچویں آیت ہے، جس کا حوالہ وہ بار بار دیتا ہے:

﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

[التوبہ : ۵]

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو، جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ بات سیاق وسباق سے الگ کر کے کی جارہی ہے۔ یہاں بات سورۂ توبہ کی پہلی آیت سے شروع ہورہی ہے۔ اور ان مشرکین مکہ کا ذکر کیا جارہا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے ایک امن معاہدہ کیا تھا اور پھر یک طرفہ طور پر معاہدہ توڑ دیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں واضح انتباہ کردیا گیا کہ یا تو چار ماہ کے دوران معاملات سیدھے کرلو اور یا جنگ کے لیے تیار ہوجاؤ۔ اور مسلمانوں کو کہا گیا کہ جنگ کے دوران انھیں جہاں پاؤ قتل کردو۔

فرض کیجیے امریکہ اور ویت نام کی لڑائی کے دوران امریکہ کا صدر اپنے فوجیوں کو کہتا ہے کہ دورانِ جنگ دشمنوں کو جہاں پاؤ قتل کردو اور میں آج یہ بات آپ کے سامنے اس طرح کرتا ہوں کہ:

''امریکی صدر کہتا ہے کہ ویت نامیوں کو جہاں پاؤ قتل کردو۔''

تو یقیناً امریکہ کا صدر آپ کو قصائی ہی لگے گا۔ لیکن جنگ کے تناظر میں کوئی بھی جرنیل یا سربراہ حکومت یہی کہے گا کہ ڈرومت اور اپنے دشمنوں کو قتل کرو۔ وہ اسی طرح ان کا حوصلہ بلند رکھ سکتا ہے۔ پھر پانچویں آیت کے بعد وہ سیدھا ساتویں اور آٹھویں آیت پر پہنچ جاتا ہے۔ چھٹی آیت کو نظر انداز کردیتا ہے، کیوں؟

اس لیے کہ اس آیت میں اس کے اعتراض کا جواب موجود ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو۔ اور پھر اسے محفوظ جگہ تک پہنچادو۔ اگر وہ اسلام قبول نہ بھی کریں، پھر بھی جس مشرک نے پناہ مانگی ہے، اسے امن کی جگہ تک پہنچاؤ۔

آج کون سا جرنیل اپنے فوجیوں کو یہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اگر دشمن پناہ مانگے تو اسے محفوظ مقام پر پہنچا کر بھی آؤ۔ محض معاف کرنے یا چھوڑ دینے کی بات بھی نہیں ہو رہی بلکہ بحفاظت مقامِ امن تک پہنچانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج کون سی فوج، کون سا جرنیل یہ حکم دے سکتا ہے؟

لیکن قرآن یہی حکم دے رہا ہے۔

لیکن اپنے محبوب موضوع یعنی مسلمانوں کو ظالم ثابت کرنے کے لیے ارون شوری اسی طرح سیاق و سباق سے ہٹ کر حوالے پیش کرتا ہے۔

اس کا دوسرا پسندیدہ موضوع ''خواتین کے حقوق'' ہے اور یہاں بھی آیات کے حوالے دیتا ہے۔ اور یہ وہی آیات ہیں جن کا حوالہ تسلیمہ نسرین جیسے لوگ دیتے ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں ارون شوری سے مباحثہ کیوں نہیں کرتا؟

میں نے ایک دفعہ تسلیمہ نسرین کے حوالے سے ہونے والے ایک مباحثے میں شرکت کی تھی جس کا اہتمام ''بمبئی یونین آف جرنلسٹس'' نے کیا تھا۔ جب میں نے اس مباحثے کی وڈیو ریکارڈنگ کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ حالاں کہ اس مباحثے کا عنوان تھا:

''کیا مذہبی انتہا پسندی آزادیٔ اظہار کی راہ میں رکاوٹ ہے؟''

یعنی عنوان تو آزادیٔ اظہار ہے لیکن مجھے وہ گفتگو ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کیا یہ منافقت نہیں ہے؟ میں نے انھیں کہا کہ وہ بھی اس ریکارڈنگ کی کاپی رکھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔ بالآخر خاصی بحث و تمحیص کے بعد مجھے اس مباحثے کو ریکارڈ کرنے کی اجازت ملی اور آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میں انتہائی کامیاب رہا۔ وہ لوگ اسلام کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے، ذاکر نائیک کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مباحثہ انتہائی کامیاب رہا۔ اس میں میری ذاتی قابلیت کا کوئی دخل نہیں تھا محض اللہ کا کرم تھا کہ میں کامیاب رہا اور اتنا کامیاب رہا کہ کسی ایک اخبار نے بھی اس مباحثے کی خبر نہیں

لگائی۔

عیسائیوں کی طرف سے اس مباحثے پر فادر پریرا موجود تھے۔ ہندوؤں کی نمائندگی ڈاکٹر ویدویاس کررہے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے میں تھا اور تسلیمہ نسرین کی کتاب کا مراٹھی ترجمہ کرنے والے اشوک صاحب بھی مباحثے میں شریک تھے۔ اگر اس مباحثے کی ریکارڈنگ نہ کی جاتی تو بھلا کس کو اس کے بارے میں پتہ چلتا؟ لیکن آج صرف بمبئی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں لاکھوں لوگ یہ ریکارڈنگ دیکھ چکے ہیں۔

اور ارون شوری کے اس حوالے سے تمام اعتراضات کے جوابات بھی ایک کیسٹ میں موجود ہیں۔ اس کیسٹ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں میری گفتگو ہے اور دوسرے حصے میں سوالات کے جوابات ہیں۔[1] اور ان میں وہ سوالات بھی شامل ہیں جو ارون شوری اٹھاتا ہے۔

رہا سوال ارون شوری کے ساتھ مناظرے کا۔ تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ مباحثہ کیا جائے؟ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ کسی بھی وقت مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ آئے............ اهلاً وسهلاً

شرط یہی ہوگی کہ یہ مناظرہ سرعام ہوگا، لوگوں کے سامنے ہوگا، بند کمرے میں نہیں۔ اور اس کی براہِ راست ریکارڈنگ بھی ہوگی۔

بہت بہت شکریہ

تمت بالخیر

truemaslak@inbox.com

☆......☆......☆

www.deenekhalis.com
www.rahehaq.com
www.esnips.com/user/truemaslak

---

(۱) اُردو ترجمہ ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کے نام سے دار النوادر کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

















